



نہیں۔ اس لیے تفصیلی تعارف کچھ دیر بعد۔ اور کچھ یوں بھی کہ نشی کا تعارف یوں چلتے پھرتے چند الفاظ میں بیان ہو جسمی نہیں سکتا۔

اور میں....؟ میرا تعارف؟ ہاں وہ بھی بعد میں۔  
تیز تیز قدموں کے ساتھ میں آگے بڑھا اور دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھتے ہی مجھے اندر سے نشی کی چمکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”یہیے.... ہارون بھی آگئے۔“  
میرا ہاتھ لمحہ بھر کوہنڈل یہ ہی رک گیا۔

اپنے پوری ٹکوئیں کارلاک کر کے اترتے ہوئے میں فرنٹ سیٹ سے وہ گفت اٹھانا نہ بھوا جو ابھی راستے سے میں نے نشی کے لیے پیک کروایا تھا۔

نشی میری بیوی بے فی الحال اتنا تعارف کافی ہے۔ دراصل مجھے اندر جانے کی جدیدی ہے۔ میں پہلے ہی اپنے روشن نامم سے پورے ایک خونریت ہوں۔ اس ایک سکھنے کے ازالٹ کیے میں نے چر پیکیں ہزار کا بریلیٹ قلبے بیات مگر مزید وقت ضائع کرنے اور پھر اس کا جواز پیش کرنے کے میرے بس اور کوئی بہانا

## مکمل ناول



مصنوفیت سے نشنسے کے بعد بھی ایک اپنچھے اور "سدھائے" ہوئے شوہر کی طرح خود کو فریش اور ہر دم ایکٹھا اور انر جیٹک ثابت کرتے ہوئے بہت اسی ترو تازہ سی مسکراہٹ چڑے پر سجا کے آگے بڑھا۔

"یہ ہیں میرے بسبینڈ، ہارون صدر۔"

اس تحریہ انداز میں کرانے گئے تعارف پر جس چڑے نے نظریں انھا کے مجھے اشتیاق سے دیکھا۔ وہ مجھے ہٹر بڑا کے چند قدم پیچھے ہٹنے پر بجور کر سکتا تھا، اگر مجھے اپنے اعصاب پر مکمل تنہول نہ ہوتا۔ اس جانے پہچانے چڑے اور اس خاصی مانوس سی عیارانہ انداز میں کچھ ٹھولتی ہوئی نظروں کو پہچاننے کی کوشش کے دوران بھی یقیناً میری مسکراہٹ پھیکی نہ پڑی ہوگی۔

"ہارون یہ ہمارے نئے پڑوی ہیں۔ سجان دانہ والا کا بنگلہ اب انہوں نے خریدا ہے۔ کل ہی انہوں نے ہمارا کلب بھی جوان کیا ہے اور وہیں ہمارا تعارف ہوا۔ اور آج مسز خواجہ ہمیں اپنی ہاؤس دارمنگ پارٹی میں انوائش کرنے آئی ہیں۔"

"مسز خواجہ؟" میں نے زہن میں دھرا ہم۔ یہ چڑہ جس کی یاد دلا رہا تھا، وہ کسی خواجہ کی تو نہیں البتہ کسی ملک یا شاید چودھری کی مسز ضرور تھی۔

"میں نے مسز خواجہ ت کہہ دیا ہے کہ....." "او پلیز نشی ڈارلنگ! اتنے فارمل انداز میں مجھے مسز خواجہ کہہ کے مجھے اتح کپلیکس میں بتلامت کرو۔"

اس میدے کی بوری نے بڑی نزاکت کے ساتھ اپنی کانٹیکٹ لینز، مصنوعی پلکوں اور میک اپ سے بو جھل، متور مسی آنکھیں پٹاپٹ کر کے نشی کی بات کائل۔ کھل کے مسکرانے سے اس کے سگریٹ نوشی سے پیلے ہوتے رانتوں کی ایک جھلک پھر سے مجھے کچھ یار دلا گئی۔

"پلیز کال می شیلا۔"

"شیلا! میں چونک انھا۔

شیلا..... آئی، شکارن، زخمی عورت، بوڑھی قیامت..... یہ وہ سارے خطاب تھے جو ہم یاروں نے اسے دے رکھے تھے۔

اس کا اور میرا آمنا سامنا تقریباً سات برس بعد ہورہا تھا مگر وہ دیسی کی دیسی تھی۔

اتی ہی جوان.... اور اتنی ہی بوڑھی۔

میرے یار دوست آیک تو اس وقت آتے نہیں تھے۔ دوسرے بن بلائے یا بغیر اطلاع کے تو ہرگز نہیں۔ میرے رشتے داروں کا بھی دماغ خراب نہیں تھا جو وہ نشی کے روپیے کو جانتے اور پر کھنے کے بعد بھی بقاگی ہو شد و حواس یہاں کارخ کرتے اور اگر وہ ہوتے بھی تو کم زکم نشی کا الجہ خوشنگوار نہ ہوتا۔

ہونہ ہو، یہ نشی کے رشتے داروں میں سے کوئی ہو گا۔ اس خیال نے جیسے میرے دل پر منوں برف گرا دی۔ میرا دل شدت سے چاہنے لگا کہ میں یہیں سے پلت جاؤں۔ ان یہیں سے کسی کا بھی سامنا کرنا میرے لیے دشوار ترین مرحلہ ہوتا تھا۔ وہ سب مجھے ایک ایسا غاصب تصور کرتے تھے جس نے ان کے تمام حقوق پر قبضہ ہمالیا ہو۔ اور وہ ان سب کی چھپتی ہوئی نظریں، وہ دل کاٹ دینے والے فقربے اور کھلی ناپسندیدگی۔

بھر جال اندر تو جانا ہی تھا۔ ذہنی تدمول کے ساتھ میں اندر دا خل ہوا۔

میرے جدید طرز کے بنے بنگلے کے وسیع اور بے حد اسائیلش انداز میں سمجھے لوٹنگ روم کے ایالین صوفے پر "وہ" دھنسی ہوئی نشی سے نشی نے میرے آنے کی خبر دی تھی۔ دھنسی ہوئی کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ وہ جو بھی تھی خاصی "وزنی" تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی اس لیے عمر کا اندازہ میں نہ کر سکا۔ اگرچہ اس کے بال ڈالی کے ہوئے تھے مگر یہ چیزاب عمر کا اندازہ لگانے کے لیے ناکافی تھی کیونکہ اب تو کم عمر لڑکیاں بھی یہ شوق رکھتی تھیں، خود نشی ہر دوسرے سال اپنا، میر کلر چنچ کر لیا کرتی تھی۔

ان ہی بلونڈ مگر روکھے پھیکے بے روان گردن سے ذرا نیچے تک آتے بالوں میں، اس انجھانی خاتون نے اپنی انگلیاں چلا میں تو مجھے ان چھپلی کے پیٹ جیسی رنگت والے ہاتھ کی چڑھی مرجلد سے اس کی عمر کا..... اور ان سلوٹ زدہ بھدی انگلیوں میں پھنسی ڈاکنڈ اور پلانشیم کی آدھ درجن انگوٹھیوں کو دیکھ کے اس کی حیثیت کا بھی اندازہ ہوا۔ اس کی عمر کا اندازہ گرنے کے بعد اس سے ملنے میں یا تعازف حاصل کرنے میں یقیناً مجھے کوئی دیکھی نہیں ہونا چاہیے تھی، مگر اس کی حیثیت کا اندازہ ہونے کے بعد یہ دیکھی تم نہ ہو سکی۔ میں سارے دن کا تھکا ہارا ایک سر کھیادینے والی

کے لیے دو دن ناکافی ہوتے ہیں تو بڑی رائے قائم کرنے کے لیے دو منٹ بھی ناکافی ہی ہیں۔“

”اب میں کیسے سمجھاؤں۔ وہ کسی بھی زاویہ سے ایک اچھی عورت نہیں لگ رہی تھی۔“

”اچھی عورت؟ کیا مطلب ہے؟“ اس نے اپنے تراشیدہ اور مغرور ابرو پکھے اور کمان کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تصور ہے تمہارا اچھی عورت کے بارے میں؟ ہو گا، ہی تمہارا مخصوص مدل کلاس اسٹینڈرڈ، وہی گھسا پتا دیلویز کام اف امولا..... کہ کوئی پردے کی بو بو ہے، بدرنگ سے کپڑے پہنے ہوئے ہے، ٹولی چیل کے ساتھ پھر رہی ہے تو پھر ”اچھی عورت“ ہے اور زر اکوئی نک سک سے درست رہنا جانتی ہو، خود کو میں نہیں رکھنے کے فن سے واقف ہو تو وہ چاٹر اور نمائشی ہے۔ یہی ہے تمہارے ہاں کی سوچ؟“ اس نے میری دم پر پیر رکھا۔ یہ اس کا بڑا کارگر حربہ تھا۔

”کتنی زندہ دل عورت ہے یہ شیلا! جانتے ہو اس کی عمر کیا ہوگی؟ فقٹی فوری۔“

”جاننا ہوں۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”واث؟“

”میرا مطلب ہے صاف لگ رہا تھا۔“ میں گڑ بڑا گیا۔ ”کوئی کتنی بھی لیپاپوئی کر لے، عمر بھی کبھی چھپتی ہے۔“

”ایکن ان اتح میں بھی وہ کتنی ایکسو۔ اور زندہ دل

ہے۔ کل ہی اس نے کلب جوان کیا اور جم میں اس کے ساتھ درک آؤٹ کرتے ہوئے میں اس کا اسنیمناد کیک

اس کی عمر جیسے سات سال پسے رک سی گئی تھی۔ نہ آگے بڑھی تھی نہ پچھے سرکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اسے ایک منٹ میں پہچان گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ پہچانے کے بعد بھی مجھے یقین نہ آ رہا تھا، کیونکہ سات سال کے عرصے میں انسان میں ظاہری طور پر بہت سی تبدیلیاں آجائی ہیں، خصوصاً ”ایک عورت میں۔“

چالیس کا ہندسہ عبور کرنے کے بعد وہ بہت تیزی سے ڈھلنے لگتی ہے مگر شیلا کے ساتھ ایسا کچھ نہ لگ رہا تھا۔ وہ سات سال پہلے جب پہلی بار مجھے ملی تھی، تب بھی چالیس اور پیٹا لیس کے درمیان میں زبردستی پھنسی ہوئی لگ رہی تھی اور اب بھی وہی حال تھا۔

لیکن مجھے میں یقیناً بہت سی تبدیلیاں آجکی تھیں جو وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ اگر وہ پہچاننے کے باوجود صرف نشی پر ظاہر نہ کرنے کی غرض سے انجام بنے رہنے کا ذرا مہ کر رہی ہوتی تب بھی میں اس کے چھریے کے تاثرات سے بھاہبی لیتا۔ مگر وہاں مکمل اجنبيت تھی۔ اس کی حریص سی نظریں اگر میرے چہرے اور سر اپ کو نئول رہی تھیں تو وہ عادت سے مجبور تھی۔

”ناکس اومیٹ یو سنباروں!“

اس کا ہاتھ میرے سامنے پہیلا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اسے تھامنا ہوا۔ آن بھی اس کی بھیلی میں اتنی ہی حدت اور نمی تھی۔ وہ پینے سے چیگا اور حشی سالمس میں نے سیکنڈ بھر بعد ہی اپنا ہاتھ داپس چھیخ لیا۔

”میں انتظار کروں گی کل شام۔“

بہت جانے پہچانے سے الفاظ مگر مختلف پس منظر کے ساتھ۔

وہ چلی گئی۔ مگر مجھے بہت سے اندیشوں میں گرفتار کر گئی۔

”اچھی لیڈی ہے۔“ نشی کا تبصرہ مجھے سلاگا گیا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اختلاف رائے کو اپنی ذات اور اپنے خیالات پر کھلی تنقید تصور کرتی ہے، میں نے اس کی اس بات پر بدلانا گواری کا اظہار کیا۔

”تھیا اچھائی نظر آگئی تمہیں دو دن میں؟ انتہائی فضول اور چھپھوری سی عورت لگ رہی تھی۔“

”اور تمہیں کون سا چھپھور پن اور برائی نظر آگئی دو دن منٹ میں۔ اگر کسی کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے

عمران و انجست کا ایک حیرت لیکر سلسلہ

امروٹس

آب روحتوں میں مثالغ ہو گئی ہے۔

مکتبہ عمران ڈائجیٹل میڈیا اردو بیوار کراچی

اور چپ چاپ اپنے عجیب ہونے کا الزام قبول کر لیا۔

”ایسی وے! تمہیں یا مجھے اس شیلانامی عورت کی ہاؤس دارمنگ پارٹی میں جانے کی قطعاً“ کوئی ضرورت نہیں۔ ڈارلگ! تم بہت معصوم ہو اور ناجیر کار بھی۔ ”میں نے اس کی موی عقل کی خصوصیات مذہب الفاظ میں گنوا کیں۔

”اس خواجه کے بارے میں، میں نے اپنے سرگل میں کچھی اچھی نیوز نہیں سنیں۔ بڑے نو دلیتے سے لوگ ہیں اور سنابے، نیب والوں کی خاص نظر کرمے اس پ۔ ایسے دو نمبر اوکول سنتے دو رہنا ہی، بہتر ہو گا کوشش کرنا کہ دوبارہ ایسی نوبت نہ آئے کہ اس عورت کو ہمارے گھر تک آنا پڑے۔“

”تھی ایسی باتوں سے بہت گھبرا تی تھی، اس لیے اس نے فوراً“ ہای بھری۔ اب پتا نہیں کتنا دنوں تک وہ میری ہدایت ہے عمل کرنے والی تھی اور کچھ ہو سکتا ہے دنوں کے بعد وہ اچانک سیہ کھتی۔

”ارے نہیں ہاروں! تمہیں کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہو گی۔ وہ خواجه تو بہت مشہور معروف بزنس میں ہے اور ان کی نیسلی.....“

مگر کم از کم وقت طور پہ تو میں نے شکارن آئی کو اپنے گھر سے دور کر دیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اچانک نشی کی نظر اس گفت پہڑی جسے مہماں سے لئے گئے جو شیخ میں صوفی پہ رکھ کے بھول گیا تھا۔

”تمہارے لیے ایک پارا سا گفت۔“ میں نے اس کا دھیان بٹھنے پہ اللہ کا شکر ادا کیا۔

”ہاو، بیوی فل..... سو سویٹ آف یو ہاروں! اکتنے اپنے ہو تم۔“ نشی نے لہر کے میرے گلے میں اپنی بانیہیں ڈال دیں اور میرے کان میں گھس کے میری تعریف کرنے لگی۔

سونے کی اس کے پاس کی نہ تھی۔ بیش قیمت جواہرات کا بھی ذہر لگا تھا اور ہیروں کی بھی اچھی خاصی کلیکشن تھی اس کے پاس۔ یہ پیکیں ہزار کا بریسٹلیٹ اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ معنی رکھتا تھا، میرا پیار اور میری توجہ جس کی وجہ سے آج ہم ساڑھے چار سال بعد بھی ایک ساتھ تھے۔

کر جران رہ گئی۔“

”لیں یہ جیلان مجھے بھی ہوتی تھی۔“ میں بردرا یا۔ ”لیکن پتا نہیں ہمارے اس مردوں کے معاشرے کو کیا پڑا بلمہ تے۔ چاہتے ہیں کہ بس عورت کی شادی کو تمہارے دس سال ہو جائیں؟ میں چار بچے ہو جائیں دیں وہ اپنی سو شل لائف کو فل اسٹاپ لگادے۔ صرف اور صرف گھر کی ہو کے رہ جائے۔ شیلا جیسی عورتوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے پچاس سے اوپر ہونے کے بعد بھی زندگی کی روائق اور کہاں گئی میں اپنا حصہ دسوالے کی آخر جرات ہی کیوں کی؟ کیوں بھی، اور ایسچ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ مر گے۔ آپ کے دل سے ساری خواہیں ختم ہو گئیں۔ آپ کا اچھا ہے، اچھا لگنے کو دل نہیں کرتا؟ دوستوں کے ساتھ ہمومنا پھرنا، وغیرہ سبب ختم؟“

”ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اب تم جیٹنی کی دیکھا دیکھی دو پولی نیلز بنائے فرائک کے ساتھ تو نہیں گھوم سکتیں۔“ میں نے اپنی تین سالہ بیٹی کا نام لیا۔ ”جیسے بچپن گزر جاتا ہے مالی ذر ادیسے ہی ایک دن جوانی بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ بچپن کے ساتھ بچپنا، معصومیت، گھلنڈر اپن اور بے فکری اڑن چھوڑ ہوتی ہے، ایسے ہی جوانی بھی اپنے ساتھ رعنائی، دلکش اور امنگیں سمیت کے لے جاتی ہے، باقی اگر کچھ رہ جاتا ہے تو صرف چند ادھوری خواہیں، جن کو وقت پہنچنے دفنایا جائے تو وہ حرص اور ہوس میں بدل جاتی ہیں۔ آخری وقت تک زبردستی خود کو حسین اور جوان تسلیم کرواتے رہنا، حرص ہی تو ہے۔ گھنڈر سے بدن کے ساتھ بھاریں تحریر کرنے کی کوشش کرنا ہوں ہوں ہی کملاتی ہے۔“

”پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔“

جب وہ بارے لکتی تو اپنی ہار کا تو نہیں البتہ میرے عجیب و غریب اور مشکل پسند ہونے کا اعلان کر دیتی۔ یہ اس بات کا اظہار ہوا کہ میری بے سرو یا گفتگو اس کے سر سے گزر رہی ہے۔ حالانکہ تب تک وہ اچھی طرح میرے موقف کو جان چکل ہوتی، مگر قائل ہونے کا اعلان کیسے کرے؟ یہ اس کی اناپہ کاری ضرب کے متراff ہوتا۔

مجھے اس کی اتنا کے ساتھ ساتھ اپنی سلامتی بھی عزیز تھی، اس لیے میں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی نہ جتلایا

بجھے میں ایک اچھا اور تابع دار شوہر بننے کی تمام صفات موجود تھیں۔ میں بُرے سے بُرے حالات میں بھی رسمی تزویکے بھاگنے کے بجائے اپنا کھوٹا مفہومی سے پکڑے رہنے کو ترجیح دیتا، اس لیے اس نے اپنے باپ رحمان شخ سے فرمائش کر کے مجھے ”لے آیا۔“ ان دنوں میں نیازیار تھاں شخ کے پاس ملازم ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں، ایک تو کوئی بھی ملازمت مجھے ملتی مشکلی سے تھی اور جاتی آسانی سے تھی۔ ایسے میں رحمان شخ نے جب ایک مستقل ملازمت کی آفریکی تو میں انکار نہ کر سکا۔ نشی کو میرے جیسے ضرورت منداور تابع دار شوہر کی ضرورت تھی تو مجھے اس جیسی مالدار مگر جذباتی ہی عورت کی، جو پیار کے دوست ہے بول سن کے آسانی سے الونائی جا سکتی ہو۔

شراب اور دیگر عیاشیوں نے رحمان شخ کے اندر کچھ بھی نہ پھوڑا تھا۔ شادی کے بعد میں نے بھرپور محنت کر کے درحقیقت اسے مزید عیاشیوں کا بھرپور موقع فراہم کیا۔ اس کے باشہ سالہ کھوکھلے جسم کو یہ بد پرہیزی موافق نہیں آئی اور ایک ڈیڑھ سال کے اندر ہی وہ چل بسا۔ تب سے میں ہوں، نشی ہے اور نشی کی کل کائنات، میری ہے۔ نشی کو ہینڈل کرنا بہت آسان ہے۔ وہ بے چاری مانگتی ہی کیا ہے صرف بھرپور توجہ، دن رات، امتحنے بیٹھتے محبت کا اظہار اور اس کی ہاں میں ہاں ملانا۔

اور ان سب کے بد لے اس نے مجھے کیا کچھ نہ دیا تھا۔ اپنی صورت میں ایک خوبصورت اسماڑ یوی، جنی جیسی باری ڈول اور ابھی آٹھ میں پہلے ایک گول مثول سایٹا یہ کروڑوں کا بزرگ ایسا اور اس کے کل اختیارات یہ ہائی فائی اسٹینس، جو میں تھے بھی خواب دخیال میں بھی حاصل کرنے کا تصور نہ کیا تھا۔ یہ ساری سولیات یہ عیش و آرام سب اسی کی بدولت تھا۔ میں نہ تو ناشکرا تھا، ہی ندیدہ۔ اسی لیے صرف اور صرف نتی یہ اکتفا اور قناعت کرتے ہوئے حقیقی وفاداری کا ثبوت پہنچنے کئی سالوں سے دے رہا تھا۔ دیے بھی میری طلب یہ آسائیں اور مقام ہی تھا جو نشی کی بدولت آج میری دسترس میں ہے۔ عورت ذات سے میری دلچسپی؟ چلیں جانے دیں۔ نشی سے وفاداری میری پاک رامنی کا مکمل ثبوت ہے۔

میرا خیال ہے نشی کا تعارف کرتے کرتے میں نے اپنا تعارف بھی ساتھ ہی کر دیا ہے۔ کچھ پوائننس دو ہمارا شکار نہیں تھی۔ اس نے مجھے پسند ہی اس وجہ سے کیا تھا کہ ہوں۔

نشی جس طبقے سے تھی وہاں خواہشات کا پیدا ہونا بھی ایک ناممکن ہی بات تھی۔ جب آنکھے کھلتے ہی سب کچھ میسر ہو، ہوش سنجاتے ہی ہر چیز دسترس میں ظیر آئے۔ تب دل میں کسی چیز کی حرمت پالنا ایک انجان سا تجربہ ہوتا ہے۔

نشی کو سب کچھ مایا مگر توجہ نہ ملی، ماں نے اسے چھے سال کی عمر میں ہی پھوڑ گئی تھی۔ دنیا تو نہیں البتہ یہ ملک ضرور پھوڑا تھا اس نے اپنے تھے شوہر کے ساتھی۔ اور دوبارہ پاٹ کے نہ دیکھا کیونکہ نیا شوہر بھی پرانے والے سے کم امیر تو نہ تھا ورنہ شاید کوئی طالب، کوئی ضرورت پہنچنے مرنے پر مجبور کر دیتی۔

رحمان شخ، یعنی میرے سرمنے دوبارہ شادی کا تجربہ نہ کیا البتہ یارا بست تھے۔ بھی کون لمبے میں بھیں پالنے کا تردد کرے جب..... ان تھی مصروفیات میں نشی ماں کے بعد باپ سے بھی اور ہوئی تھی۔ دوسرے رشتے داروں سے میں ماپ بھی بس برائے نام ہی تھا۔ ماں کی طرف سے جو رشتے تھے وہ ماں کے ساتھی ہی جھٹت گئے، اور باپ کا سرگا بھن بھائی کوئی تھا نہیں، رشتے کے بھن بھائیوں کو مطلبی اور حریص جانتے ہوئے وہ خود ایک فاصلہ رکھ کے ملتے۔

اس ماحول میں یتے بڑھتے نشی دو ہری شخصیت کی مالک بن گئی۔ ایک طرف تو وہ اپنی دو اس کی جنزیشن کی طرح اپنے آکے کی کوچھ نہ گردانے والی اور خاصی حد تک خود پسند و خود سرکھی تو دوسری جانب حیرت انکیہ طور پر اس میں پہنچ نہیں کلاس خصوصیات بھی پالی جاتی تھیں۔ وہ اپنی کلاس کی دیگر لڑکیوں کی طرف کیروں بنا نے پا بھر آزاد بے قکر لائے انجوائے کرنے کے بجائے ایک گھر بانے کی متمنی تھی۔ واضح رہے، صرف شادی کرنے کی نہیں بلکہ حقیقتاً ”ایک گھر بانے کی آرزو مند..... درنہ ان سائزے چار سالوں میں اس کی کتنی ہی سیلیوں نے اپنے شوہریوں بد لے تھے جیسے کوئی کرائے کا گھر دلتا ہے۔ اب اس شیلانامی خاتون، ہی کی مثال سامنے ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سات سیال پہلے یہ کسی چودھری یا ملک نائب بندے کی سزا کملاتی تھی، اور اب یہ خواجہ نامی بزرگ میں.... شاید اسی لیے وہ خود کو شیلا کملائے جانا پسند کرتی ہے، شوہر کا کیا ہے، وہ تو آئے دن بد لئے والا آئشم ہے۔ اپنا زالی نام ہی مستقل ہوتا ہے۔ مگر نشی اپسی ماحول میں پانے بڑھنے کے باوجود اس سوچ کا شکار نہیں تھی۔ اس نے مجھے پسند ہی اس وجہ سے کیا تھا کہ

ہوئے سال بھر ہی ہوا تھا لیکن اس نے اپنے کام اور ذہانت سے مجھے اس حد تک مطمئن کیا تھا کہ میں بڑے اعتماد سے اسے ایسے کام بھی سونپ دیا کرتا جو خالص تھا۔ میرے کرنے والے تھے۔ مہک میرا انتخاب تھی۔ وہ گفتگو کے فن سے آشنا تھی، مخاطب کو پیشے میں امتحان جانتی تھی اس لیے میں صرفوفیت کی وجہ سے اکثر میٹنگز میں اسے اپنی نمائندگی کے لیے بھیج دیا کرتا۔ بزرگ کے داؤنچ کھینا بھی خوب جانتی تھی اور۔ کیا چاہیے تھا مجھے۔ میری اپنی عادت کی وجہ سے ہماری ازدواجی زندگی پر سکون تھی۔ تی بھی یہ اندھا بلکہ اندھا دھنڈ اعتماد کرتی تھی۔ میں اکثر مہک کے ساتھ میٹنگز اپنیڈ کرنے آؤٹ آف ٹاؤن بھی جایا کرتا۔ کبھی باہی اسیرو تو بھی باہی روڑ۔ لیکن نہ تو مہک نے میرے ساتھ تھا سفر کرنے کے خیال سے کبھی گھبراہٹ یا عدم تحفظ محسوس کیا نہ ہی تی کے دل و دماغ میں شک کے سائے لہرائے۔ آپ کو کسی کی محبت کے ساتھ ساتھ اس کا اعتماد بھی حاصل ہو جائے یہ اعزاز کم نہیں ہوتا۔

اس وقت بھی مہک میرے ساتھ ہی میٹنگ میں گئی۔ چلو اس کا جانا تو سمجھ میں آتا ہے۔ وہ ایک لحاظ سے میرا رائٹ پینڈ تھی۔ مگر حریت مجھے ان پر تھی جو اپنی میڑک پاس سکریٹریز کو بھی بنا سنوار کر پسلوں میں سجائے پلے آرہے تھے۔ جن کے پاس سوائے میریان مسکراہوں، تھہ در تھہ میک اپ اور ہر زادی سے خود کو نمایاں کرتے ڈریز کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اور کے پورشن تو سب ہی کے خالی تھے۔

”لگتا ہے سب ہی آئے ہیں۔“ میں نے یہاں سے دہاں تک نیبل کے گرد ریکھا۔

”یاں لا ہور کی ٹریڈ یونین کے بھی بست سے لمبڑا بلائے گئے ہیں۔“ کسی نے اطلاع دی۔

”اوہ فرقان بٹ بھی ہو گا۔“ میں نے قیاس ظاہر کیا۔ وہ میرے لا ہور کے زمانے کا اچھا دوست تھا۔

”دنیں وہ تو آج کل ساٹھ افریقہ میں ہے، البتہ اس کی جگہ اس کی سکریٹری آئی ہے۔“

”اوہ نہ... سکریٹری....؟“ میں نے تمثیر سے کر جھٹکا۔ وہ میرا دوست ضرور تھا لیکن تھار جمانی شیخ کے قبلے کے مردوں سے۔ جتنی وسیع اس کی جائیداد تھی، اتنے ہی وسیع رتبے پر اس کا تن دیوتاش پہلیا ہوا تھا اس لیے ویسے تو کوئی چیزیادام میں آتی نہ تھی۔ اسے جب کسی کو گھیرنا ہو گا تو

میں ہارون صدر، ایک اوئیڈیل کلاس سے تعلق رکھنے والا، مگر غیر معمولی حد تک پر کشش مرد، جس نے اتفاق سے پچھے تعلیم بھی حاصل کی۔ اس طرح سے اسے تی کی نظرؤں میں آنے کا موقع ملا۔

یہاں پہ کچھ محدود سوچ کے حامل افراد مجھے موقع پرست لائی اور خود غرض بھی قرار دے سکتے ہیں مگر میں اسے اللہ کی دین سمجھتا ہوں کہ ایسے موقع ہر کسی کو نہیں ملتے اور میں نے اس موقع کو ضائع کر کے ناشکری کا ثبوت نہیں دیا، بلکہ اس سے اپنی زندگی بستر بنانے کا کام لیا۔ اب چاہے کوئی مجھے جو بھی کئے۔

یہاں میری محنت، لیکن اور قابلیت کو نظر انداز کرنا زیادتی ہو گی۔ میں نے ان گزرے سالوں میں اپنے شرابی اور عیاش فطرت سر کے کاروبار کو بڑھایا ہی ہے، ہر کم نہیں کیا۔ اگر تی نے میری ذات پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے کل اختیارات سونپے ہیں تو میں نے بھی اسے دو کے چار بنا کے لیے ہیں۔

ایسا ہی ہوں میں..... ہارون صدر۔



”سر آج آپ کو ٹریڈ یونین کی ہنگامی میٹنگ میں بھی شرکت کرنا ہے۔“

میری سانوی سلونی مگر بے حد ایکنو اور اسماڑت سی سکریٹری نے مجھے اطلاع دی۔

”ہاں.....“ میں نے تھکن اور بے زاری کا اظہار کیا۔ کام جتنا بھی ہو، میں اس سے تھکتا یا گھبرا تانہ تھا۔ دو کو چار اور چار کو آٹھ بنانے کا موقع جب ملتا اور جہاں ملتا، میں جھپٹنے کو تیار تھا لیکن ایسی صروفیات یہ میرے نزدیک زاد وقت کا زیاد تھا۔ صرف اور صرف سر کھپائی۔ حاصل وصول کچھ نہیں۔ لیکن ایسی بے مقصد اور بے سروپا میٹنگز میں شرکت کرنا میری مجبوری تھی کیونکہ میں اس ٹریڈ یونین کا جنرل سکریٹری تھا اور اگرچہ اس یونین کے مقاصد سے مجھے کوئی دلچسپی بھی نہ ہی کوئی واپسی، اس کے باوجود میری نظریں سکریٹری کے عمدے سے زرا اور پر یونین کے پریزیڈنٹ کی سیٹ پر لیتھیں۔

”اپنی دے مہک! تم پچھے اہم پوائنٹس نوٹ کر لینا اور بس دیکھ لینا... تمہیں تو پتا ہی ہے۔“

میں نے یہ سارا کام اسے سونپا۔ اگرچہ اسے اپنے

اے اپنی سیکریٹری کی سیٹ آفر کرو دیتا۔

”فرقان بٹ کی سیکریٹری تمہارے مشورے سے پائیش ہوئی ہوگی۔“ ایک مشترکہ دوست اور کاروباری ساتھی نے پورے دلوقت سے کہا۔

”میں نے اسے ڈی انساف، آفس سے دور کرنے کا مشورہ ضرور دیا تھا مگر امید نہیں تھی کہ وہ اس پر عمل بھی کرے گا۔“

”ان فیکٹ وہ ڈبل مزے میں ہے۔ اسے یوئی اینڈ ماننڈ کا شاندار کبی نیشن ماتھ لگا ہے۔ وہ تمہاری طرح صرف صلاحیتوں پر شکریہ ادا کرنے والوں میں سے نہیں۔ سنابے سونیا نام کی اس سیکریٹری کو اس نے ماڈل ٹاؤن میں ایک منہنگا فلائٹ کرائے رہے کر دے رکھا ہے۔ گھر میں خاصاً تازعہ انھوں کھڑا ہوا تھا جس کے ازالے کے لیے وہ اب نیملی کے ساتھ ساوتھ افریقہ میں ہے۔“

”ان ہی تازعوں سے تو گھبرا تاہوں میں۔“

”مردوں والا جگر بیدا کرو یا!“ میرے دوست نے مجھے اکسانے کی کوشش کی۔

”ویسے ان محترمہ سونیا کا حدود ارتعہ کیا ہے؟ خاصی دیکھی بھالی سی صورت لگ رہی ہے۔“ کسی نے جاننا چاہا۔ ”دیکھی بھالی ہوگی۔ کسی زمانے میں ماڈلنگ کر چکی ہے۔ بست نامور تو نہیں رہی مگر اس فیلڈ سے اس فیلڈ تک آتے آتے خاصی پالش ہو چکی ہے۔ اسی لیے فرقان بٹ بھی اسے خاصانو از رہا ہے۔“

پانیں کس کے آنے پر یہ بات ادھوری رہ گئی مگر میں جان گیا کہ وہ کیا کہنے جا رہا تھا اور واقعی اس بات کو جان کر مجھے افسوس ہوا۔ دلی افسوس۔

”تم یہ زندگی جی رہی ہو سیکینہ جاوید؟ کیا اس سے کئی گناہ ستر وہ زندگی نہیں ہوتی۔ جو میں تھیں دے رہا تھا۔“

میں نے نظر بھر کے اسے دیکھا اور غیر محسوس طریقے سے سب کے درمیان سے انھوں کے اس کی طرف چلا آیا۔

”کیسی ہو سیکینہ جاوید؟“

”مس سونیا۔“ اس نے فائل سے سر اٹھا کے گویا نئے سرے سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ چشمہ اتار چکی تھی۔ اور اب اس کی گھری بھوری آنکھوں کی ساری دھشت ساری دریانی مجھ پر عیال تھی۔

”سیکینہ سے سونیا۔“ سونیا نے سوبنی، سوہنی سے پھر سونیا کیا یہ واپسی کا سفر ہے؟“

”میرے لیے پچھے پچھے نہیں رکھا جو میں واپس لوٹنے کی

لیکن جب وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر سامنے آئی، تب میں کتنی ہی دیر پڑیں تک نہ جھپک سکا۔ وہ سونیا تھی....

سوہنی.... یا پچھے.... سیکینہ جاوید۔

میں حیران رہ گیا۔

انتہے سالوں بعد اچانک اس کا لمنا اور وہ بھی اس طرح۔ مجھے پر درپے پیش آئے اتفاقی حادثات کا اس سے پہلے کوئی خاص بجربہ نہ تھا۔ میری ذاتی رائے تھی کہ یہ پھوپھن صرف فلموں اور ذرا مول کے لیے مخصوص ہے۔ وہ جو بھی تھی اس دنیا میں شاید میں تھا جو اس کے اصل سے واقع فہم تھا۔ اور ہاں اس دنیا میں شاید نہیں بلکہ یقیناً ایک وہی تھی جو میرے یعنی ہارون سفدر کے اصل سے را قف تھی۔

شیلا کی طرف اس نے عمر کو جیلوں بہانوں سے باندھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آئندہ سال پہلے کی انیس سالہ سونیا میں اور آج کی تھیں ستائیں سالہ پیچھیوں۔ عورت میں خاصاً فرق تھا۔ آج اس میں خود اعتمادی تھی۔ اس کا سر اٹھا ہوا تھا اور اس کے وجود میں کڑواہت کے بجائے بلکہ سی سو گواری گھلی ہوئی تھی۔ ایک بات جو ویسی کی ویسی وہ یہ کہ آج بھی وہ پہلے کی طرح اکیلی لگ رہی تھی۔

ان روشن کھلی کھلی بھوری آنکھوں پر نیا اضافہ گولیڈن فریم والا ناٹک سماجشہ تھا۔ وہ پہلے سے ہی لگ رہی تھی، بال ویسے ہی گھنے اور گھرے بھورے تھے۔ البتہ اب اس کے بال ساوگی سے پچھے بند ہے ہوئے تھے جبکہ پہلے عجیب ماتھی انداز میں بکھرائے رہتی تھی۔ کس قدر ناپسند تھا مجھے اس کا بال بکھرائے رہنا۔

باتھ میں بال پوائنٹ تھا۔ وہ بار بار اس باتھ کو اوپنچا کر کے اپنے پاؤنس نے تلے انداز میں تنہانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا لیجہ شاید زمانے کی سختی نے نیزم کر دا لاتھا ورنہ کسی سونیا تھی جو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ یوں تو کم بولتی مگر جب بھی منہ کھلتا کوئی جلا کنافروہ برآمد ہوتا۔ کتنا مشکل تھا اسے برداشت کرنا۔ مگر میں کرتا تھا۔ عمر بھر کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس وہی تیار نہ ہوئی۔ اس کی قوت برداشت شاید کم تھی۔

جاگتا۔ ظاہر ہے کہ تمہارے ساتھ جو جو کچھ بیت چکا ہے، اس کے بعد تم دوسروں کے پرے اتنا درد تور کھو گے کہ...."

"شٹ اپ سونیا۔" میں انہ کھڑا ہوا۔

وہ مجھے پچھے کی جانب دھکلیں رہی تھی۔ میرے ماضی کی طرف اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

"کیا ہوا؟ اتنے سالوں بعد ملے ہو اور چند منٹ میں بیزار ہو گئے، تمہیں تویساری زندگی میرے ساتھ ہنستے کھلتے گزار نے کی خواہش تھی؟"

اس نے "ہنستے کھلتے" خاصا چباچبا کردا کیا۔

"عقلتی تھی میری۔" میں نے پٹک کے اعتراف کیا۔ "اور شکر گزار ہوں میں تمہارا۔" میں نے اس کے سامنے مشکور انداز میں ہاتھ جوڑے۔ "کہ تم نے میری یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ ورنہ جس زندگی کب کی حتم ہو چکی ہوتی۔"

"چلو، آج اتنے عرصے بعد ہی سی، میں کم از کم ایک الزام سے تو بری ہوئی۔" اپنے پچھے مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ لیکن اب میں پلنے کا روادار نہ تھا۔

میں اس کے اصل سے اور وہ میرے اصل سے واقف تھی۔ میں اس کا اور وہ میرا ماضی جانتی تھی۔ یہ جواب بھی ابھی ہوا ہے۔ ہمارے شاری کر لینے کی صورت میں شاید روز کا معمول ہوتا۔ یونہی آئینے ہاتھ میں لیے ہم اک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگے رہتے۔ زرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو اس کے کریہ ماضی کے طعنے دے رہے ہوتے۔

"جو ہوا، اجھا ہوا۔" میں نے اعتراف کیا۔

اس سے الگ ہونے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی طرف سے ٹھکرائے جانے کے ڈریھ سال بعد میں نے یہ الفاظ پہلی بار تبارک کے تھے جب رحمان شیخ میرے باس نے مجھے اچانک ہی اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے بطور شوہر یمند کر لیا۔ اور آج دوسری بار یہ الفاظ میں ادا کر رہا ہوں جب بڑے عرصے بعد کسی نے میرا ماضی مجھے یاد دلانے کی کوشش کی۔



میں نے یہ تو بتایا تھا کہ میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس فیملی سے ہے مگر یہ چھپا لیا تھا کہ میں ایک پسمندہ سے قبے سے اٹھ کے لاہور آیا تھا۔ وہ ضلع سرگودھا کے نواح میں

خواہش کروں۔" اس نے فاکل بند کرنے کے ایک جانب رکھی اور مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تو تم اب تک لاہور میں ہی ہو؟"

"ہاں... مٹ چھٹا کے تو تم بھاگے تھے۔" اس نے شاید مسکراہٹ چھپاٹ کی کوشش کی تھی۔

"میں بھاگا نہیں تھا۔" آس پاس کے ماحول سے یکسر بیگانہ ہو کے میں اچانک بلند آواز میں چلا آنھا۔ اور پھر خود ہی خائف ہو کے چور نسلیوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بلند و پانگ تھقوں اور باتوں کا شور اس قدر تھا کہ کسی نے میرا یہ بلند احتیاج نہ سنا تھا۔

"میرا چھپی طرح جانتی ہو کہ مجھے لاہور چھوڑنے پر تم نے بجور کیا تھا۔"

"میں نے؟" اس نے کمال مخصوصیت کا مظاہرہ کیا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کم آن باروں صفر۔ تم ہمیشہ سے اپنی غلطی کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تراش لیتے ہو اور وہ ہوتا ہے کسی نہ کسی کو سورہ الزام ٹھہرانا۔ آئھ سال بعد ملے بھی ہو تو مجھے الزام گانے اور وہ بھی بے بنیاد۔"

"کیوں، کیا تم وہ قسیں ہو، جس نے آئھ سال پلے بغیر کسی رحم کے مجھے نامراد اور نایا تھا۔ پھر میں لاہور میں رہ کر کیا کرتا؟"

"میں بھی تو رہ رہی ہوں۔ میری کون سی سرادر پوری ہوئی ہے یہاں۔" وہ مسکراہٹ۔

"خیر سے تمہیں تو شاید ہجرت راس آئی۔ پڑھتی رہی ہوں گا کے بے گاہے اخباروں میں تمہاری ترقیاں۔"

"ہاں لیکن تمہیں مجھے سمجھکر انار اس نہیں آیا۔" میں نے چوت کی۔ "بائی داوے کیا کر رہی ہو تو فرقان بٹ کے پاس؟"

"وہی جو ایک سیکریٹری کر سکتی ہے۔"

"سیکریٹری..... یا...." میں نے نقروہ ادھورا چھوڑ دیا۔ "سیکریٹری تو میری بھی ہے۔ بہت بڑی لینت ہے مگر میں اس کی صرف زیانت استعمال کرتا ہوں اور اسی ایک صلاحیت کی تھواہ بھی ریتا ہوں جو صرف اٹھمارہ ہزار روپے ماہانہ ہے۔ اسی میں ہزاروں کی شاپنگ، رہنے کے لیے فلیٹ اور کار ہرگز شامل نہیں۔"

"تم ایسا کر سکتے ہو ہاروں صفر! اگر فرقان بٹ یا اس جیسے دوسرے مرد نہیں۔ وہ ایسے کسی دوسرے نہیں گزرے کہ تمہاری طرح ان کے دلوں میں بھی کسی کا احساس

کر دے اور شر جا کے پڑھنے کا اعلان کرے تو باپ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اب اک رشتے کی ایک بہن سرگودھا میں رہتی تھیں میں ان کے گھر کے برآمدے میں اگلے دو سال تک رہا۔ اور سرگودھا کے ذگری کالج سے انٹر بھی کر لیا۔ ان دو سالوں میں پھوپھی کے بیٹوں کے ساتھ کئی بار لاہور شر جانا ہوا اور میں جو سرگودھا آکے خود کو شہ، شہی بھجنے لگا تھا، لاہور کے آگے مجھے سرگودھا اب نہ پہنچتا تھا۔ میں لاہور کے کالج سے لی اے کرنے کے خواب دیتے تھے۔ پتا نہیں اب اس کی اجازت ملتی یا نہیں۔ ویسے تو انہیں کیا اعتراض ہوتا، ویسے بھی گاؤں کی زندگی میں باپ کا سترہ اٹھا رہ سالی کی عمر کے بیٹے کا خرچہ اٹھائے رکھنا بڑی حرمت کی بات تھی۔ بارہ یا زیادہ سے زیادہ پندرہ سال تک کی عمر تک پہنچتے پہنچتے بیٹے، باپ کا بوجھ اپنے شانوں پر مقل کر لیتے تھے۔ میرے بھائیوں نے بھی یہی کیا تھا۔

”چل اچھا ہے، ہارون پڑھ لکھ جائے گا۔“ یہ میرا سب سے بڑا بھائی تھا۔

”اب زمانہ بدل رہا ہے ابا تعليم کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔ چلو، ہم میں سے بھی کوئی افریگ جائے گا۔ ہم چھ کم تو نہیں تیری زمینوں کے لیے۔ چل شنزارے! تو پڑھ جتنا پڑھنا ہے پڑھ لے، بس یہ خیال رکھنا کہ افریگ تھری میں نہ بھول جانا۔“

میرے بھائی کا خیال تھا کہ شاید چودہ جماعتیں پاس کرتے ہی مجھے افری ملنے والی تھی۔

ہائل کے اخراجات کچھ زیادہ تھے اس لیے میں نے ٹیشنز پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ پھوپھی کے گھر سے کالج کا رستہ بھی پیدل کا تھا۔ پھوپھی کے بچوں کو لکھنے پڑھنے سے خاص شغف نہ تھا، پھر بھی مارے باندھے پڑھی رہے تھے، پھوپھی ان کے سامنے مجھے کسی ماذل کی صورت پیش کرتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں خود کو پوری طرح بیبا اور سیدھا سارا بچہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ابا کا خیال تھا، لی اے بھی اسی طرح چند سورپے مہینے بیچ کے کروالیں گے لیکن لاہور آکے میری مصروفیات اور خرچا، دونوں میں اضافہ ہوا۔ بھائیوں نے تیوریاں چڑھا کے میرے ماہانہ خرچے میں دو تین سو کامزید اضافہ کر تو دیا۔ مگر ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے مفت کی کھلانے پر تیار نہیں۔ میرا افسر بننا جس دن انہیں ضرورت سے زیادہ مہنگا محسوس ہوا، وہ اس خواہش سے دست بردار ہونے میں

واقع ایک گند اسا گاؤں تھا۔ ویسا صحبت افزا، ہر بھرا گاؤں نہیں جیسا کہ فلموں میں دکھایا یا انسانوں میں بتایا جاتا ہے۔ یہ گندی نالیوں، ان پر بھنپھناتی کمھیوں، ہر طرف کھلے پھرتے آوارہ کتوں، بستی ناک والے میلے گالیاں بکتے بچوں، اور نت نتی بیماریوں کو ایجاد کرنے والا گاؤں تھا۔ اس میں ریکارڈ تعداد میں ایشیا بنانے والے بھنے لگے تھے جن کے کالے دھوئیں نے فضا کو کثیف اور لوگوں کے سینے داغ دار کر دیے تھے۔ وہ اتنا پسمندہ تھا کہ اس میں لڑکوں تک کا کوئی بالی اسکول نہ تھا۔ یہ میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں، یعنی آج سے پندرہ سولہ سال پہلے کی بات۔ ہو سکتا ہے آج رہاں ہالی اسکول ہی نہیں، مگر لڑکاں تک بن گیا ہو۔ بھر حال میں نے پندرہ سال پہلے جب میڑک کیا تب میں اپنے قبے سے اٹھا رہ جا کر تھا جو سرگودھا شر سے مانع تھا اور ہمارے گاؤں کی بہ نسبت خاص اتری یافتہ تھا۔ یہ اٹھا رہ کلو میڑک کا فاصلہ دن میں دوبار میں مختلف طریقوں سے طے کیا کرتا۔ بھی تو بڑی سڑک پر کھڑے ہو کے کسی گزر تے ہوئے ترک، ریڑھے یا زارے سے لفت لے کر بھی اس سڑک پر جا کھڑا ہوتا، جہاں سے ریل کی پسروی گزیری تھی اور کراسنگ بھی تھی۔ اگر دوسری ٹرین کی آمد متوقع ہوتی تب پھانک بند ہوتا اور ٹرین کو رکنا پڑتا۔ میں موقع ہاتھ لگاتے ہی کسی نہ کسی ڈبے میں سوار ہو جاتا اور لکھنے بھر کا سفر، پندرہ بیس منٹ میں طے ہو جاتا۔ یوں دوسری کے آسرے میں نہ دسویں کا امتحان پاس کریا۔

میرے ابا جی لڑکوں کے معاملے میں خاصے خود کفیل تھے۔ ان کے ہال لیارہ لڑکے پیدا ہوئے جن میں سے خوش قسمتی سے سات زندہ رہے۔ میرا نمبر چو تھا۔ یعنی میں درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ بس کوئی نہیں تھی یعنی خاندان برادری کی نظریوں میں اللہ نے میرے ابا کو خوب نوازا تھا، کوئی بوجھ نہ دیا تھا۔ میرے بڑے تینوں بھائی دو دو چار چار جماعتیں پڑھ کے ابا کے ساتھ ہی کمیتوں پر کام کر رہے تھے اور باقی تین بھی دو چار سے آگے پڑھنے کے مود میں نہ تھے۔ مجھ سے چھوٹا والا بھائی، میرے بچا کے ساتھ ساتھ لگا رہتا، ان کی دو بیٹیاں تھیں، لڑکا کوئی نہ تھا۔ وہ خود اسے اپنا داماد بنانے اور اپنا آڑھت کا کاروبار اسے سونپنے کا اعلان بھری برادری میں کرچکے تھے۔ چھوٹے دو کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جاتا ایسے میں اگر ایک بیٹا زمینوں پر جانے سے انکار

لیے پرستالٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں ٹیوشنز بھی تو پڑھا سکتا ہوں۔"

"تمہارے پاس کھر ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"کھر بینھ کے تم پر امری یا نہ کے بچوں کو دوسروں پے لے کے ٹیوشن پڑھا سکتے تھے، جیسا کہ اکثر میرک پاس یا انہر پاس لڑکیاں کرتی ہیں لیکن تم تو رہتے ہو باشل میں۔ کھروں میں ٹیوڑوں لوگ رکھتے ہیں جن کے پچے ہائی فائی اسکو اول میں پڑھ رہے ہوتے ہیں یا جو زیادہ فیس دینا انورڈ کر سکتے ہوں کہ مسٹر ٹیوڑ آپ کی اپنی کوالیفیکیشن کیا ہے؟ یا یار انگریزی تمہاری اٹوئی بچوں ہے، اردو تک کا تلفظ تھیک نہیں ہے۔ کچھ تان کے گزارے لائق نمبر لے آئے ہو۔ ادئے تمہیں کھر میں گھنے کوں دے گا۔"

سب منہ پھاڑ کے ہنٹے لگے۔ میں جھینپ سا گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجید کے تائے کی دکان پر کام کرنا پڑا۔ گزارا ہونے ہی لگا۔ پہلے میں کی خواہ سے میں نے اپنے لیے کچھ ڈھنگ کے لباس خریدنا چاہے، اس موقع پر بھی مجید ہی کام آیا۔

"یار، تو تو خاصالشک اتنا کا گیا ہے۔" اس نے پہلی بار مجھے جینز اور ٹی شرت میں دیکھ کے بے ساختہ تعریف کی۔ میرا جسم دبلا پتلا ضرور تھا مگر ہاتھ پیر کھلے اور کاٹھی مضبوط اور چوڑی تھی۔ رنگ بھین میں صاف رہا تھا مگر گردش حالات نے میرا رنگ جلا کے رکھ دیا تھا شر آیا تو چھرے پر نو خیز ساروں اچھیل رہا تھا جس نے رنگت اور میلی کپیلی سی کر دی۔ اس لیے سرگودھا تک تو میں واقعی شکل و صورت کے لحاظ سے سب کے لیے نمونہ ہی بنارہا۔ اس پر اٹھتے بیٹھتے پھوپھی کے متاسفانہ بصرے۔

"نہ کہا..... کیا سوہنا ہوتا تھا..... اب تو نجما ہوا انگر بن کے رہ گیا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ان کا چھوٹا بد تیزی بیٹا "مکڑوں کوں" کی بانگ بلند کرتا۔

کھرچ کھرچ کے شیو بنانے سے مغل پورے کی نر کے کنارے کری ڈال کے بیٹھے جام نے میری اصل شکل نکال ہی دی۔ باشل کے کھروں میں دھوپ کیا خاک ہوتی، تازہ ہوا کا گزر بھی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ میرے چہرے کی کالک چھٹنے لگی۔ میرا بے ڈول سالمیشیا یا واش اینڈ ویر کا عجیب رنگت والا لباس میرا مصنوعہ اڑانے میں مدد رہتا تھا لذدا پہلی

وقت نہیں لگائیں گے۔ پھر باشل کے دوستوں کی مدد سے میں نے کوئی کام تلاشنا چاہا۔

"یار تمہارا حلقہ ایسا ہے کہ معقول قسم کے کسی اسٹوریا بوتیک میں تمہیں سیلز میں بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ سیلز میں تک بخے کے لیے ضرورت ہوئی ہے تھوڑی سی اسلامت نہیں، تھوڑی سی حاضر جو الی کی اور پچھے ہو شیاری کی اور یہ ساری کی ساری خصوصیات تم میں مفقود ہیں۔"

میرے ایک دوست نے خاصی بے رحمی کے ساتھ تجزیہ کیا، وہ تیک کے ایک بڑے بوتیک میں سیلز میں تھا۔

"تمہارے شر کے راستوں سے بھی ناواقف ہو ورنہ تمہیں اپنے ریسٹورنٹ میں پارٹ ناکم جا ب داواریتا۔"

میرا یہ روم ہیث ایک فامت فوڈ ریسٹورنٹ میں ڈیوری بوائے تھا۔

"ایک کام سے تمہارے کرن والے۔" مجید نے کہا۔ وہ میرا واحد دوست تھا جو پکالا ہو ریا تھا۔

"انارکلی میں میرے تائے کی دکان ہے، دی بھلے، فروٹ چات وغیرہ میں۔ بڑی چلتی ہوئی دکان ہے اور سب سے پرانی اور مشہور بھی۔ سچ نوبچے سے لے کے رات بارہ بجے تک رش رہتا ہے۔ اتنے تھنھشوں تک تو کوئی نہیں ساتا۔ اس لیے شفیعیں لگائی ہوئی ہیں ہیلپر لڑکوں کی تم اپنی سوابت سے وقت بتا دیں لکواریتا ہوں۔ چار گھنٹے کے اتنے قابل جائیں گے۔ جتنے میں تمہارا گزارا آرام سے ہو جائے۔"

"بھجھے کرنا کیا ہو گا؟"

"وہ سب جوان دکانوں پر ہو سکتا ہے۔ پہاڑ چھیلنے، آلو ابائے سے لے کر پھیل کانے تک اور پٹیں سجا کے عورتوں کے آگے پیش کرنے سے لے کر برتن دھونے اور میز کر سیاں جھاڑنے تک سب کچھ....."

"یہ سب میں کروں گا؟" میں ناگواری حیرت سے کہا

"نا تو اور تیراما کرے گا۔ شنزارے! اک نظر اپنے آپ پر ڈال۔ اس گول گھیرے کی چوبے رنگ کی شلووار قیص پسے ہاتھ کے بنے کولہوں تک آئے ٹنگ والے سویٹر "تارے میرے" کے تیل سے باند دیتے کھیچ کے نکال مانگ والے بالوں کے ساتھ کوئی تجھے "سالٹ اینڈ پیپر" میں دیش تولگا نے سے رہا۔ ایسی جگہوں پر یہی کام کرنے کے

ہنائی ہوئی عمارت تھی اور ہندو طیز تعمیر کا ہی نمونہ تھی۔ عمارت رنگ دروغن سے محروم تھی۔ ہر وقت جس رہتا۔ نہانے دھونے کے لیے قریبی حمام میں جانا پڑتا۔ کمرے سے ملحوظہ ٹواںکٹ اتنا مختصر تھا کہ وہ صرف جوانج ضروریہ کے کام ہی آیا تا۔

ہاشم کا ٹروہ میں چار لڑکوں کے ساتھ شیئر کرتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس کمرے سے خاصا بستر اور ہوادار تھا۔ میں یہاں بیزار ضرور ہوا مگر ہر میٹنے پکے ہوئے چند سورپے یہاں رہنے پر مجبو کرتے۔ چند ہفتوں بعد میں عادی ہوئی۔

اس دوران میں بست کم اپنے گاؤں گیا۔ پہلی بار وہاں جیسز پس کے گیا تو میری اجذبہایوں نے مذاق کر کر کے میرا ناک میں دم کر دیا۔ بھائیوں نے بھی ان کے مذاق کے جواب میں میرا روکھا پھیکا انداز اور ناگواری دیکھی تو فتویٰ سادر گردیا۔

"منڈے نوں لا ہو رہی ہو الگ گئی اے۔"  
بے بے نے کمیں میرا شدید کی بات کی تھی مگر میں نہ خانہ صاف بتا دیا۔

"شادی تو میں لا ہو رہیں کروں گا۔"

"خیر اس لا ہو رہیں کو اپنے لا ہو رہیں کو رکھنا۔ مجھے بذھے دیلے (بڑھائیے میں) اپنے سر میں کھے (مٹی) نہیں ڈالوں، شرن نوں لائیں۔" بے بے نے رکھائی سے جواب دیا۔

"بست بست شکریہ اس اجازت کا" میں کون سا سے اس میوزیم میں لا کر رکھنے والا ہوں۔ "میں نے دل ہی دل میں جواب دیا۔

بیسوں سال لگ گیا تھا۔ جوانی پورے جوبن پہ تھی۔ ہر دوسری لڑکی مجھے اپنے خوابوں کی شہزادی نظر آتی۔ میرے چہرے سے پینڈوں پن بقول میرے دوستوں کے کہ کا رخصت ہو چکا تھا۔ ان ڈیڑھ سالوں میں دو تین بار ہلکی پھلکی سی نظریازی اور رقعہ بازی بھی چلی چند ایک سے مگر معاملہ آگئے نہ بڑھ سکا۔ یعنی کوئی زور دار چکرناہ چل سکا۔ اور شہزادیوں کے خواب دیکھنے والا ہارون صدر ایک معمولی سی لڑکی پہ مرٹا۔ سکینہ جاوید پہ۔

تنخواہ آتے ہی میں نے اس انضول لباس سے جان چھڑانے کا سوچا۔ ٹنگ جیسز اور شوخ رنگ کی لی شرت میں میرا المبارز نہ کاہا، لوپچا اور چوڑا سرپا ابھر کے سامنے آیا۔ اس روز میں نے خود اپنی ذات میں بے پناہ اعتقاد محسوس کیا۔ سارے یار دوست بجھے اپنے ساتھ بونے سے محسوس ہوتے تھے۔

دو تین ماہ کے عرصے میں ہی میں نے محسوس کیا کہ پچھے لڑکیاں کاچھ کے یونی فارم میں کھن سے سیدھی انار کلی صرف چاٹ کھانے تھیں آئی تھیں۔ میری خوش بھی یہاں تک پرواز کر جاتی کہ وہ چاٹ کھانے نہیں۔ مجھے سے ملتے آئی تھیں۔ ان کے ساتھ بلکل پتلائی نوک جنم کا پھولی مولی فقرے بازی کو خوب تک منق ٹھا کے یاروں کے سامنے بانٹتے تھیں بھی مجھے آیا تھا۔ جیب میں نالتو پیسے نہ تھے تھے شش بھی پیدا نہیں۔ روز رات کو فلم دیکھنا، ہر نیچی اسٹیڈیم جا کر ٹمکت خرچ کر کے دیکھنا۔ ابھی بی اے کے امتحان میں یورت سات ماہ باقی تھے۔ اگر اب اسے مزید رقم کا مطلبہ کرتا تو وہ سات میں مزید خرچ کیجیے کے بجائے مجھے واپس بالیتے۔

"تو میرے کمرے میں کچھ آئی۔" اعیینہ عرب نیفا بکری نے صلاح دی۔ وہ پاک بین کا رہائشی تھا اور ہاشم کے بجائے لکشمی چوک کی کسی سال خورده سی جو میں۔ ایک سکرے میں رہتا تھا۔ تھے وہ بڑے شماں تھے۔ "تمیث" کا نام دیتا۔

"آٹھ سورپے کرایہ بے پہلے میرے ساتھ ودا منجی ہو تا تھا۔ آج کل وہ سرال میں ہے۔"

"سرال.....؟ گھر جوائی؟"

"او نہیں یار! اندر ہو گیا ہے دیتے تو دوڑھائی میں تک آجائے کا لیکن میں اب اسے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔ اچھا ہمانہ ہو گا کہ اولی اور پہلی بھی اس کی جائے۔ چار سو روپے تم دے دینا۔"

یہ ہاشم کے کمرے کی نسبت کچھ کم ہی تھا۔ میں راضی ہو گیا کہ میں کے بکواس کھانے وہ بھی اتنے منگے سے بھی جان چھوٹے ہی۔ لکشمی چوک لا ہو رکے "کھانوں" کا گڑھ ہے۔ یہ ایک اور لائق تھا۔ واقعی اس زمانے میں لکشمی چوک لا ہو رکے باقی علاقوں کی بہ نسبت پُر و نقی ہونے کے باوجود ستابخا۔

سو میں اپنا بوریا بسترا نہا کر دہاں ٹکرایا۔ "رام لعل میشن میں۔ یہ تسلیم سے بھی بست پہلے کی کسی ہندو کی



نہیں ہوئی اور اگر ہوئی تو انہیں ساتھ نہیں لیں گے۔“

”کہاں...؟ میرا مطلب ہے کہاں جانا ہے؟“

”بڑا زبردست پیش شو ہو رہا ہے، انٹر نیشنل یول کالنے سے انڈیا کے بھی بہت سے فنس ڈینر اور ماڈل شرکت کر رہے ہیں۔“

ایک تو اس کے اس شوق سے میں بے حد عاجز تھا۔ زیادہ حیل و جست کا منظاہرہ کر کے اس کے دل میں کھنک بھی پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے چارونا چارا سے ساتھ لے جانا پڑا۔ درنہ پروگرام تو میرا کچھ اور تھا۔ اگرچہ سو نیا کے ساتھ میں نے اکڑ کے کھاتا کہ میں اس سے نہ ہی ملتا تو اچھا تھا مگر میلنگ سے واپس آنے کے بعد اب تک یہ ملاں تھا کہ عرصے بعد ملے تھے تو میلنگ سے ملے ہوتے۔

وہ دی لڑکی بھی جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں بہت دور سے آگراں کے رستے میں کھڑا ہوا کرتا تھا۔

اور وہ دی لڑکی تھی جس کے خطرائے جانے کی میں اب بھی کبھی کبھار تنائی میں کراہنے پر مجبور کر دیتی بھی۔ اور اسی لڑکی کو قسم نے دوبارہ ملایا بھی تو میں.... مجھے رہ رہ کے اپنی جذباتیت پر غصہ آ رہا تھا۔

اسی لیے میں نے لاہور جانے کا فیصلہ کیا۔ فرقان بٹ تو پاکستان میں تھا ہی نہیں۔ اس لیے اس کے فضول سوالوں سے با آسانی بچا جاسکتا تھا اور قدرے پر سکون ماحول میں ٹھنڈے مزاج کے ساتھ میں اس کا حال بھی جان سکتا تھا۔ شروع شروع میں ایک آرہ بارلاہور جانے کے بعد میں نے اپنی گاڑی کا رخ لکھی چوک کی جانب موڑنا چاہا۔ یہ اندازہ لگانا چاہا کہ وہ اب تک وہی ہے یا کمیں اور..... مگر میں ایسا کرنہ سکا۔ اور بعد میں تھی نے کچھ ایسی ان دیکھی زیبیوں میں باندھا کہ لاہور جانے کے بعد بھی اس کا خیال تکنہ آیا۔

اس کا جسی کو پہلی بار دیکھ کے ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ جیسے تجھے کو بنایا گیا ہو میرے لیے۔



”لڑکی... اور وہ بھی اتنی خوبصورت اور وہ بھی رام لعل میشن میں؟۔“ میں نے راشد کا گزدی کو ٹھوکا دیا۔

”کہاں جائے پھر بے چاری؟“

”کیا مطلب....؟ دیکھیے تو ”چھڑوں“ (کنواروں) کا ادا ہے نا۔“ میں نے پوچھا۔ اس بلڈنگ میں زیادہ تر چھڑے

”میں لاہور جا رہا ہوں۔“

میں نے کھر آتے ہی نشی کو مطلع کیا۔ مقصود یہ تھا کہ وہ میرا بیک تیار کر رہا ہے مگر وہ میکریں چھوڑ کے اٹھو چکیں۔

”That's Great“ میں بھی چاہوں گی۔“

”میں وہاں ایک انتہائی بورسیم کی بزرگیں ڈینگ کے لیے جا رہا ہوں۔“ میں نے اسے باز رکھنا پا یا۔

”اوہ ہو تو میں کون ساتھ اس ساتھ چکی رہوں گی۔“

”پھر کیا ناکہدہ۔“ میں نے اسے حقیقتاً پہنچانا چاہا۔

”لی ہیو باروں اپنے پیدا روم نہیں ہے۔“ اس نے سامنے ڈائینگ سیبل سیٹ لری میاز مہ اور یونیک گارپٹ پر بیٹھ کے بلاکس کے ساتھ کھیلی جیسی کی طرف اشارہ کیا۔

”تو چلو پھر...“ میں نے آنکھیں ماری۔

”لاہور؟“ میں فضل قسم کا رد مانس جہاڑ کے اس کا دھیان جس بات سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔ وہ وہیں کی وہیں اپنی ہوئی بھی۔

ایک نہیں دی سانس بھر کے میں خود بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ صوفی پر ختم دراز ہو کے میں نے نالی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

”جیسی کا اسکون؟“ ایک کمات بھی سو جہما۔

”وہ پلے گروپ میں ہے، ہن! اور ابھی اسے اسکوں میں ایڈ مٹ ہونے دو تھیں تھیں تو ہوئے تھیں۔ دو دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”لاہور کا سو ستم بہت گرم ہے ان دنوں۔“ ایک اور ڈراؤ۔

”مجھے کون سا سرکوں پر پھرنا ہے۔“

”تو پھر کرنے کیا جانا ہے؟ ناہور ہے، کوئی پیرس یا سوئنزر لینڈ تو نہیں جس کا نور مس ہونے کا افسوس زندگی بھر تمہیں ستائے گا۔“

”بات کیا ہے ہاروں!“ وہ ذرا سنبھل کے بیٹھی اور اس کی تیز نظریں میرے آریار ہونے لگیں۔ میں کھبرا کے ریموٹ اٹھا کے چینل پر چینل بد لئے لگا۔

”تم مجھے لے جانے سے Avoid کیوں کر رہے ہو؟“

”ڈونٹ لی سلی ڈارنگ! میں تو تمہاری بریت اور بچوں کی وجہ سے کہہ رہا تھا، ان سے لاہور کی گری برداشت نہیں ہوگی۔“

”ان کی گورننس ہمارے ساتھ جائے گی۔ دن کو ایر کنڈیشنڈ رومن میں رہیں گے اور رات ابھی اتنی بھی گرم

نکتی - ”

”یعنی تم کہنا جاتے ہو کہ اس کی ماں..... یعنی ماشر صاحب کی وہ بیوی بازار سے تعلق.....“

”شکر ہے تمہارے بھیجے میں بھی کوئی بات بغیر تفصیل سنائے اتری ہے۔ صحیح سمجھئے۔“

”اس نے جانے کیے دیا اتنی خوبصورت لڑکی کو۔ یہ لوگ تو اس معاملے میں بڑے سخت ہوتے ہیں۔“

”لڑکی چار جماعتیں پڑھ گئی تھی، منہ کو آنے لگی ہو گی اور پھر ماں نے سوچا ہوا گا باب کی محبت جاگی ہے، جانے دو، وہ بیماریوں کا گھنٹر چاردن کامہان ہے اس کے بعد آنا تو اس نے ماں کے پاس ہے۔ مگر بھی شباباں ہے یہ لڑکی اتنے عیش و آرام چھوڑ کے اس گند میں لی بی کے مارے باب کے ساتھ رہ رہی ہے۔ میں نے ناہے مری کے ہائل میں پانچ سال پڑھتی رہی ہے۔ طلاق کے فوراً ”بعد وہاں گئی دو سال پہلے واپس آئی تو سیدھا باب کے پاس۔ اب پتا نہیں کہاں چھوٹی مولی نوکریاں کر کے اپنا اور باب کا پیٹ پال رہی ہے۔“

”میں ایک دم ہی اس کامنی سی لڑکی سے بے پناہ متاثر ہو گیا۔ جو عزت کی زندگی گزارنے کی تمنا لیے، عیش و آرام اور دولت کو ہمو کمار کے نکلی تھی۔“

”میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

کچھ ہی دن بعد اسے دوبارہ سیدھیوں سے ایک تھیلا گھینٹے کی کوشش کرتے دیکھ کے میں خود کو بازنہ رکھ سکا۔ وہ بے حد نازک بلکہ کمزور، زرد روی لڑکی بست مشکل سے اس بھاری تھیلے کو اخفاک کے زینے پر رکھتی، پھر ایک قدم خود اور آتی اس کے بعد پورا زور لگانے کے دوبارہ اسے اخفاک کی کوشش کرتی۔ میں نے اسے بیشہ سرچھا کئے بغیر کسی سے بات کیے بغیر آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس سے اس کی محتاط اور سنجیدہ طبیعت کا اندازہ ہوتا تھا لیکن یہ کام شاید اسے زیادہ ہی مشکل لگ رہا تھا کیونکہ میرے جیسے اجنبی کا مخاطب کرنا بھی وہ برداشت کر گئی اور خاموشی سے تھیلا ایک طرف چھوڑ کے پچھے ہٹ گئی۔ یہ میری مدد قبول کرنے کا اعلان تھا۔

”تمہیلا واقعی بھاری تھا، نجائز کیا بھرا تھا اس میں کہ وہ پہنچنے کے قریب تھا۔“

”کیا ہے اس میں.....؟ سو ماں اسلف وغیرہ؟“

میرے سوال پر اس کے سنجیدہ چرے پر ایک

چھانت ہی رہتے تھے۔ ایسے میں اسے قیام کے اشماروں روز ایک کم سن، معموم صورت اور دلکشی دلرباہی لڑکی کو ان سیکن زدہ بوسیدہ سیدھیوں پر بھاری تھیلا اخھائے دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔

”یہ ماشر رفاقت حسین خان کی لڑکی سے اور والی منزل کے کوئے والے کمرے میں رہتے ہیں پہلے گیارہ سال سے۔ ہاں اسے آئے دو ذہنی سال ہی ہوتے ہیں۔“

”کیوں؟ کیا آسمان سے پہلی ہے؟“

”نسیں پارا بے چاری گھنیوں میں اٹکی ہے۔ دراصل ماشر صاحب کی علیحدگی ہو گئی تھی اپنی بیوی سے۔ یہ شروع میں ماں کے ساتھ رہی، اب ماشر صاحب کے پاس آئی ہے۔“

”ماشر صاحب کس اسکول میں پڑھاتے ہیں؟“ میرے اس سوال پر وہ حلق پھاڑ کے نہ۔

”کیوں؟ کیا ریاضت ہو چکے ہیں؟“

”ریاضت تو بھجوہا گیا بے مگر یہ آک دوں دوں دوں چار پڑھانے والا ماشر نہیں۔ یہ ”سام..... رت..... گا..... ما.....“ والا ماشر ہے۔“ اس نے ہمار موشم بجائے کی ایکنٹ کرتے اور راگ الائچے تو نہ بتا۔

”اوہ.... یعنی کلامیکل سنگر۔“

”تو مرضی نام دے او ہے تو.... وہی ناں...“ اس نے بڑا ناز بسا الفاظ استعمال نہیں۔

”ایسے نہیں کہنا چاہیے، فنکار ہمارے ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔“

”اوہ دلت بھجوایے فنکاروں پر.... ساری عمر شراب پی پی کے گزار دی۔ کون سی خدمت کی ہے ملک و قوم کی۔ ویسے بھی خوبصورت اور جوان لڑکیوں کے باب سے ساروں کو ہی بڑی ہمدردی ہو جاتی ہے۔“ اس نے مذاق اڑایا۔

”اس کی ماں کو کیا ہوا؟ چل بس؟“

”ہاں چل بس.... یعنی چل.... اور جا کے بس گئی۔“

”سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے۔ یوں کہو،“ اس نے دوسری شادی کر لی۔ ”میں جھٹا کے کہہ اخھا۔“

”دوسری....؟“ نہیں پار ہو گئی کوئی تیسری..... یا پھر..... اوہ ہو میں بھی کیا حساب رکھنے بیٹھ گیا، اسے تو خود یاد نہ ہو گا۔ دیسے بڑی بد قسمت عورت تھی۔ اتنی شادیاں کر کے بھی بیٹی صرف ایک ہی پیدا کی اور وہ بھی اس کے لحاظ سے

کا۔ ”اس نے کو اڑپہ یوں ہاتھ رکھا تھا جیسے ابھی شماہ کر کے بند کر دے گی۔ میں نے جلدی سے اندر آنے کا ایک موقع تلاشنا چاہا۔

”میں دیکھ لیوں تمہارے ابو کو....؟ میرا منتظر ہے ان کی طبیعت وغیرہ....“

”اس کی ضرورت نہیں، مجھ سے پوچھیں یا ان نے ایک ہی بات ہے۔ وہ کون سا آپ کو جانتے ہیں۔ بہر حال شکریہ۔“ اس نے بغیر خدا حافظ کے دروازہ بند کر دیا۔

”اوے تو اس میرا تی کی بیٹی کے ساتھ کہاں چارہ تھا؟“ راشد کانگڑی نے نجاتے کہ میری جاسوسی کی تھی۔

”ڈوٹ کارہاتھا۔“ میں چڑ کے بولا، پتا نہیں کیوں، میں یہ بات چھپانا چاہتا تھا اور جب ایسی کسی کوشش سے پہلے ہی بات کھل گئی تو میں جھنجلا گیا۔

”ہمار موسم اس کا باپ بخارہ ہو گا۔ اور کورس میں ڈانس اس کی ماں کی ہوتی سوتی کر رہی ہوں گی۔“ اس نے ٹھٹھا لگایا۔

”بکواس مت کرو۔ میں صرف اس کا سامان اپر تک چھوڑنے گیا تھا۔“ میں نے وضاحت کی حالانکہ دکان پر آنے والی شوخ دچھل لڑکیوں سے ہونے والی بے ضرر سی بات چیت کو بھی میں نمک مرچ لگا کے دوستوں میں بیان کرنے کا عادی تھا۔

”بات سنئے!“

دوں بعد اسے وہی تھیلا اٹھا کے سیڑھیوں سے اترتے دیکھا تو میں نے پکار لیا، وہ یوں تھیلا چھوڑ کے پرے ہوئی جیسے یہ میرا ہی تو کام تھا۔

”جلدوں کے ساتھ تو اس کا وزن اور بھی بڑھ گیا ہے۔“ میری بات کا جواب یہ بغیر وہ تیزی سے میرے آگے آگے سیڑھیاں اترنے لگی۔

”بس اسٹاپ تک جانا ہے؟“

”نہیں، تانگہ رکوار تھے،“ بس میں اس تھیلے کے ساتھ اترنا چڑھنا مشکل ہوتا ہے اور اردو بازار کے اندر والی گلیوں تک جانا ہے مجھے۔ اس تھیلے کے ساتھ اسٹاپ سے وہاں تک چلانا میرے لیے ناممکن ہو گا۔“

تائگے کے انتظار میں ایک طرف چھاؤں میں کھڑے ہوتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”آپ آج بھی تالا لگا کے آئی ہیں؟“ میرے سوال پر وہ محض۔ الیہ نظرلوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر سب سکراہٹ سکھتی ہوئی روشن روشن ہی نہ تھی۔ بلکہ اس بھی ہوئی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کے نقوش میں محلی اداسی کو اور گمراہ دیا۔

”وہ تو یہ رہا۔“ آہستہ سے کہہ کے اس نے ہاتھ میں تھاماً ایک شایر آگے کیا جس میں سے چائے کی پتی کا ایک روپے والا پیکٹ اور ایک پینا میں تقریباً ”اوہ پاؤ برابر کوئی دال تھماںک رہی تھی۔“ میں اپنے سوال پر شرمندہ ہو گیا۔ واقعی پیزاروں روپے کا سودا ہو تا تب ہی یہ تھیلا اس بری طرح بھر سکتا تھا۔

”اس میں کتابیں ہیں۔“ میں نے اور کچھ نہیں پوچھا تھا۔ لیکن شاید وہ میرے سوال کو ادھورا نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس لیے خود ہی بتاریا۔

”اتنی ساری کتابیں؟ تم اتنی کتابیں پڑھ لو گی؟“ اس بار پھر وہ سکراہی۔ بالکل ایسے جیسے کسی شنزاری نے جب ایک غریب کو مشورہ دیا تھا کہ تمہارے پاس روئی نہیں تو تم کیک کیوں نہیں کھاتے۔ تب وہ غریب یقیناً شنزاری کی معصومیت پر یوں سکراہیا ہو گا۔

”یہ میں اردو بازار سے لائی ہوں، جلدیں کرنے کے لیے ایک کتاب پر جلد سازی کے مجھے ڈریڑھ روپے ملتے ہیں۔ اس حساب سے یہ تھیلا میرے لیے سائز ہے چالیس روپے کی روزی ہے۔“

وہ اپنے کمرے کے آگے رک گئی اور اپنے لمبل کے بڑے سے روپے کے لمپوں سے بندھی گرہ کھول کے چابی نکالنے لگی، یہ روپہ شاید بھی نیا رہ چکا ہو مگر اب نیلا ہٹ مائل سرنسی سارہ لیا تھا۔ شلووار قیص اس نے البتہ ریشمی پس رکھا تھا، اس گری میں ریشمی سوت پس کے دوسرے وقت پاہر نکلنا اور اتنی سیڑھیاں اترنا، چڑھنا بڑی ہمت کی بات تھی۔

”اور اس کام میں تمہیں وقت کتنا لگتا ہے؟“

”اور کوئی کام نہ ہو تو ستا میں کتابوں کی جلد بنانے میں مجھے دو ہی دن لگتے ہیں۔“ اس نے زنگ آکو تالا کھول کے دروازے کے پٹ دا کیے۔

”اکیلی رہتی ہو؟“ میں تھیلا گھیٹ کے اندر تک لے گیا۔

”نہیں، ابو جی اندر ہیں۔ ان کے پیر میں چوتھی لگی ہے،“ دروازہ کھولنے نہیں آسکتے اس لیے میں تالا لگائی تھی اچھا، آپ کا شکریہ اتنا بھاری تھیلا اور منزل تک اٹھا کے لانے

نہ دیکھی مگر اس کا خیال میرے دل و دماغ سے محونہ ہوا تھا۔ انگریزی کے پرچے کی تیاری کے لیے مجھے کسی کتاب کی ضرورت نہیں میں اردو بازار گیا اور یونی میں نے دکاندار سے پوچھ لیا۔

”اس سائز کی کتاب کی جلد سازی کے لئے پیسے ہوں گے؟“

”آئھ روپے مگر تین سے زیادہ کتابیں کروانے پر ہر کتاب پر پچاس پیسے ڈسکاؤنٹ ہو گا۔“

”اتنا زیادہ ڈسکاؤنٹ۔“ میں نے طنزیہ کہا۔ ”میں تو اس کے ڈیڑھ روپے سے زیادہ نہیں دوں گا۔“

”آپ شایدِ مذاق کر رہے ہیں۔ جناب، چار روپے تو نہیں مزدوری پڑتی ہے، وہ بھی اگر میریں اپنادیں تو۔۔۔ یعنی ہر کتاب کی جلد پر ہمارا اپنا سائز ہے پاچ سے چھوڑوپے تک خرچہ ہوتا ہے۔ اس طرح منافع تو ہمارا ڈیڑھ یا ڈھائی روپے کے لگ بھگ ہی ہوتا ہے۔“

”یا تو آپ غلط بیانی کر رہے ہیں یا باقاعدے کو کوئی منگا کار گیر مل گیا ہے۔“ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر واقعی یہ آدمی پچ کہہ رہا ہے تو اس لڑکی بے چاری کے ساتھ ناصلانی ہے، وہ اس کی مجبوری سے غلط فائدہ اشمار ہا ہے۔

”اگر میں یہی کام آپ کو چار کے بجائے تین روپے فی کتاب پر کروادوں تو۔“

”تحمیک ہے، آپ کسی دن کار گیر کو لے آئیں، اس کا کام دیکھ کے بات کر لیں گے۔“

دوہی پرچے رہ گئے تھے۔ آخری پرچے سے فارغ ہو کے میں اسی شام اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

”آپ...؟ فرمائیے۔“ دروازہ کھولتے ہی اس کا جھنجلایا ہوا چہرہ نظر آیا، جس پر مجھے سامنے پا کے حیرت نمودار ہوئی۔ آج وہ لانپ کے ملکے چلکے لباس میں تھی، جس کا رنگ اڑپ کا تھا۔ قیص جگہ جگہ سے مک گئی تھی۔ شلوار کا پانچھہ گھس چکا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ باہر چلپلاتی گرمی میں بھی ریشمی سوٹ کیوں پہنتی تھی۔

”وہ..... مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔“

”مجھے سے؟ مجھے سے آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے۔“

”وہی کام جو آپ کرتی ہیں۔“ میں مسکرا یا۔

”وہک... کیا... مطلب؟“ اس کارنگ جیسے اڑ گیا۔

”جلد سازی کا... آپ کے لیے برا اچھا کام لایا ہوں۔“

”میرا مطلب ہے، آپ کے ابو بیمار ہیں اور زخمی بھی، ان کو اسکیلے چھوڑنا مناسب نہیں اور وہ بھی گھر کے اندر بند کر کے باہر سے تلا لگانا۔ خدا نخواستہ انہیں کسی کی ضرورت محسوس ہو تو پھر؟“ میری بات پر اس کے چہرے پر لگبھرا ہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔

”اگر آپ مناسب بھیں تو میں ان کے پاس چلا جاؤں۔ آن میرا کان بند ہے۔ میں فارغ تھیں، دوں۔ کام پر تو دب سر تین بیجے کے بعد جا آتا ہوں۔“

”جی نہیں شکریہ۔“ وہ آنکھوں پر ہاتھ کا چھما بنا کے سامنے دیکھنے لی۔ ہر طرف کی نرینک جباری یعنی بس ایک تانگہ بی تشنز آ رہا تھا۔

”شاید آپ اپنے نہیں چالیں سمجھتے نہیں دینا چاہتے۔“ میری اس بات کے داب میں تھی دو خاموشی ہی رہی۔ میں نے بہت نہ ہارنی۔

”میں تو ایک بیمار بزرگ کے ذیباں سے کہہ رہا تھا، آپ کی مرخصی.... دیتے میں ان کا نہیں جسمی ہوں۔“

”بب شک وہ کلتے رہت تب شک تو ان کا کوئی پرستار نہ پیدا ہوا۔ اب بب انہیں کلوگاری ترک کے بارہ سال ہو چکے ہیں اور کوئی ان لئے نام نہیں دے دیتے واقف نہیں تو۔ مجھے دیکھنے کے بعد ان کے بہت سے فیں یونی بن جیا کرتے ہیں۔“ وہ زہر بھرتے ہجے میں میری جانب دیکھے بغیر بول۔ مجھے پرکھوں پان پڑا یا۔۔۔ پچھے جتنی دیر کھڑا رہا ماہیں نے دوبارہ کوئی بات نہیں۔ بس کن انسیوں سے گاہے بلکہ اسے دیکھا ریا۔ نکرنی پاکے بڑھ کے تھیں۔۔۔ جس اور تیز دھوپ تھی اور وہ آج تھی۔۔۔ سوٹ پنچھے ہوئے تھی۔۔۔ کالے رنگ کی چادر سے اس نے خود کو پیسٹ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ، تی کی ست پاٹک کی پیلی میں اس کے پاؤں بہت اجل اجل لگ رہتے تھے۔

پھر پانہ میں کب اس نے تانگہ رکوایا، میں اس کی آواز پر چونکا اور خاموشی سے تیسا اٹھا کے اس کے پاس رکھ ریا۔ دل ہی دل میں، میں اس سے ناراضی جتا رہا تھا۔ ”ویسے تو بڑی ریز روپتی ہے اور اپنے کام نکلانے کے لیے اتنی بے تلفی...؟“



میرے لی اے کے امتحان شروع ہو چکے تھے میں پسلے سے زیادہ منروف ہو گیا۔ کتنے ہی ہفتے اس کی جھلک تک

بادا آدم کے وقت کے شکھنے کتنی بھل کھینچ لئی ہے۔ مگر بہرحال مل تو آتا ہی ہو گا۔ اور بیمار باب کی دوایہ ساری ذمہ داریاں اس نے کس لیے اپنے سر لیں اور وہ عورت جو اس کی ماں ہے، وہ کیسی بے حس عورت ہو گی۔ ٹھیک ہے طوائف ہے مگر ماں ہونے کے ناتے نہ سی انسانیت کے ناتے بھی کیا اسے اس لڑکی پر ترس نہیں آتا ہو گا جسے دنیا میں لانے کی ذمہ دار وہ خود ہے۔ ٹھیک ہے ایسے اس کے نقش قدم پر چلنے سے انکار کر دیا، لیکن کیا یہ قصور اتنا بڑا ہے کہ اسے حالات کے تھیزے کھانے کے لیے تھا چھوڑ دیا جائے؟ پتا نہیں کہاں ہو گی اور کتنے عیش کر رہی ہو گی اپنے نئے شوہر کے ہمراہ۔ مگر کیا بیٹی کے لیے چند ہزار روپیہ بھی نہیں بھجو سکتی؟۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ اس کی آواز مجھے خیالوں سے کھینچ لائی۔ بس میں سفر کے دوران سارے رستے میں انہی سوچوں میں گم رہا تھا اور ایک بار بھی اسے مخاطب نہ کیا تھا۔ اشآپ سے اردو بازار کے ہجوم میں پیدل راستہ بناتے ہوئے بالآخر اس نے مجھے مخاطب کیا۔

”آپ شاید اس دن والی بات پر ناراض ہیں؟ میں نے آپ کو اندر آنے کو نہیں کہا اور پھر ابو سے ملنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ اور آج جب میرا اپنا مطلب ہے تو میں آپ کے ساتھ چل پڑی۔ آپ مجھے بہت مطلبی اور خود غرض لڑکی کجھ رہے ہوں گے۔ ہے ناکی سوچ رہے تھے آپ؟“

”درactual میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تم نے مجھے اپنا نام کیا بتایا تھا؟“ میں نے ٹالا۔

”میں نے آپ کو اپنا نام بتایا ہی کب؟“ وہ نہیں بہت مدھم آواز میں۔ اگر میں دیکھنے رہا ہو تو شاید مجھے پتا تک نہ چلتا کہ وہ نہیں تھی۔

”میرا نام سکینہ جاوید ہے۔“

”جاوید کیوں؟ تمہارے والد تو رفاقت حسین ہیں۔“

”درactual بس میرے پیروز میں یہی نام لکھا ہوا ہے۔“ وہ گڑ بڑا ہی۔

”عجیب بات ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

”میری پیدائش کے کچھ عرصے بعد میرے والدین میں علیحدگی ہو گئی تھی، پیری ای نے دوسری شادی جاوید مختار نامی آدمی سے کی تھی۔ اس نے مجھے قانونی طور پر بھی ایڈاپٹ کر لیا تھا۔ میرے اسکول میں بھی یہی نام لکھوایا

۔ معاوضہ دکنا ہو گا۔ آپ میرے ساتھ چل کے بات کر لیں، دہیں آرڈر بھی مل جائے گا۔“ میں نے بتایا اور ساتھ ہی ساری تفصیل بھی دہرائی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ڈریٹھ کے بجائے تم روپے یعنی میں اگر سفتے میں پچاس کتابیں بناؤں تو ڈریٹھ سور روپے۔ میں ابھی آئی۔“ وہ پلٹی پھر کوئی خیال آنے پر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ ”آپ ابو جی کے پاس بیٹھیں۔ میں دو منٹ میں تیار۔“ ایک بار پھر اسے کچھ خیال آیا اور بات ادھوری چھبوڑ کے دہ پوچھنے لگی۔

”آپ چائے پیسیں گے یا ٹھنڈا....؟ موسم تو گرم ہے میں آپ کے لیے شربت...“

”میں اس کی ضرورت نہیں پھر کبھی سی۔ آج جمع

ہے۔ نماز کے لیے بازار جلدی بند ہو جاتا ہے۔ بہتر ہو گا اگر ہم جلدی نکل جائیں۔“ ابھی میں اس کے باب پاسٹر رفاقت حسین خان سے اتنا تعارف ہی کرایا تھا کہ وہ اپک جھمک لباس تبدیل کر کے آگئی۔ اب اس نے ایک بار پھر ریشمی جوڑا پس رکھا تھا۔ کاسنی رنگ کا پھول دار سوت، وہی کالی چادر کھونٹی سے اتر کے اس کے گرد تن چکی تھی۔ وہی پاٹنک کی سستی بد وضع سی چپل اس کے سک کبوتر سے پیروں میں تھی۔ لکڑی کے اسنون سے سلو رائٹنل کا جگ انہا کے اس نے پانی کے چھینٹے ایک باتھ سے اپنے چہرے پر مار کے گویا اسے ترو تازہ کیا اور اپنی چادر ہی کے پلو سے پوچھتی ہوئی کہنے لگی۔

”چلیں، میں تیار ہوں۔“

میں نے ایک نظر اس کی تیاری کو دیکھا اور راشد کانگڑی کی بتائی ہوئی باتیں پھر سے میرے ذہن میں تازہ ہونے لگیں۔

”کیا ہے یہ لڑکی....؟ کیا عمر ہو گی اس کی....؟ سولہ سال سے سترہ یا زیادہ سے زیادہ انہمارہ..... اپنی عمر کے اتنے سال نیشن و آرام اور بے فکری سے گزارنے کے بعد کیسے وہ یہ زندگی گزار رہی ہے اور وہ بھی اپنی مرضی اور خوشی سے۔ کیا اس کا جی نہ چاہتا ہو گا اچھا پسند اچھا کھانے کو۔ دن بھر اپنی ارٹکلیاں فگار کرنے کے بعد وہ اٹھے دن کے لیے چائے کی بیتی کا ایک روپے والا پیکٹ، چار پاپے، آرھا پاؤ دال اور آدھا کلو آٹا خرید پاتی ہے۔ اور اس اجڑے ہوئے کمرے کا کرایہ، بھلی کامل یقیناً ایک مرتوں سے لمب اور تھکے ہارے

ہونے لگیں، ہمارے چولئے جائز کاموں سے جلتے رہیں تو پھر... تو پھر ناجائز کام کرنے پر بجور کیسے ہوں گے ہم....؟ پیش حلال کی روشنی سے بھرنے لگا، تن دھکنے لگا تو حرام کی کمائی کرانے والے اپنا ناجائز دھن کس کو دکھا کر راہ سے بھٹکا میں گے؟"

اس کے سوال پر میں دنگ رہ گیا۔ وابسی پر اس کے قدم پلے سے زیادہ سُست تھے۔

"رکو، آؤ، تمہیں جوس پیلا آہوں۔ گری بہت ہے۔" ایک کوڈا اسپاٹ کے نزدیک رک کر میں نے کہا۔

"اگر آپ نے مجھے واقعی کام دلواریا ہو تو شاید مرتوت کے مارے یا اظہارِ منونیت کے طور پر میں آپ کی خواہش پوری کر دیتی لیکن فی الحال میری ذات یہ آپ کا کوئی احسان نہیں جسے اتارنے کے لیے میں ہوتلوں میں آپ کے سامنے بینہ کے مسکراہیں بکھیروں۔"

"تم.... تم...." مارے کوفت اور جھنجلاہٹ کے مجھ سے اس سے زیادہ نہ کہا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اس کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا، اس کے ساتھ ادھر ادھر کی ہے معنی باقیں بھی تسلی میں میری یادوں کو رنگارنگ کر دیا کرتی تھیں لیکن اس وقت اسے جوس کی آفر پیش کرنے میں میرا کوئی غلط مقصد نہیں تھا۔

"کہاں سے سیکھتی ہو تم یہ باقیں۔" اے دہیں رکا رہنے کا کہہ کے میں سامنے لپکا۔ دو جوس کے پیکٹ خرید کے لایا، ایک اس کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد کہا۔

"اب تم چاہو تو مجھ سے پیٹھ موڑ کے یہی لوٹا کہ مجھ پر یہ ایلام تو نہ لگے کہ تم سے مسکرا کے باقیں کر رہا ہوں

"آئم سوری...." کسی قسم کی شرمندگی سے عاری بے تاثر کھر دے لجھے میں اس نے میری بات کائی۔

"میں تمہیں رکشہ کروارتا ہوں۔ گھریلو جاؤ، مجھے کچھ کام ہے یہاں۔"

"میں اکیلی جا سکتی ہوں بلکہ اس سے پہلے اکیلی ہی آتی جاتی ہوں۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

"تم میری وجہ سے اتی پتی دوبھر میں خوار ہوئی ہو وہ بھی بے کار میں اس لیے۔" میں نے اپنی مرباٹی کی وجہ بتائی اور ساتھ ہی ایک رکشہ کو ہاتھ دے کر روک لیا۔

"اگر میں ناگوار نہ گزرے تو کیا میں صرف اگلے چوک تک کے لیے تمہارے ساتھ اس رکشے میں بیٹھ سکتا

گیا۔ اور میرے میزک کے سر ڈینکیٹ میں بھی یہی نام لکھا ہے اس لیے میں بھی خود کو اسی نام سے درجہ نام سے کیا فرق رہتا ہے۔"

"پھر تم اپنے ابو کے پاس دوبارہ واپس کیسے آئیں؟" میں وہ بات جاننا چاہتا تھا جو مجھے چبھ رہی تھی۔

"یہ آپ کہاں آگئے۔ کیا اسی مارکیٹ میں ہے وہ دکان؟" "شاید اب وہ چونکی۔

"ہاں وہ جس کے آگے نیلا سائن بورڈ لگا ہے۔"

"رہبر بک ڈاؤ۔" اس نے پوچھا اور میرے اثبات میں سر بلانے پر اس کے پیچرہ ہم گئے۔ وہ وہیں ایک بند دکان کے اوپر پچھے چبوڑے پر بینہ گئی۔

"تحکم گئی ہو؟"

"کیا اب بھی نہ تحکموں... یہ جانے کے بعد بھی کہ آپ جس جگہ مجھے دے گئے معاوضے کا کہہ کر کام دلوانے آئے ہیں، میں پچھلے چھے سات مہینے سے انہی کا کام کر رہی ہوں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی میں نے دبے دبے الفاظ میں معاوضہ کچھ بڑھانے کا ذکر کیا تو مجھے کوراسا جواب دے دیا گیا، یہ کہا گیا کہ ان کے پاس ایسے کاریگروں کی کمی نہیں جو قرآنی کتاب صرف ایک ربیسے لینے کو تیار ہیں، یہ تو صرف خدا ترسی کی وجہ سے یا پھر میرے لڑکی ہونے کی وجہ سے مجھے "مرنگا" ہونے کے باوجود کام دے دیا جاتا ہے۔"

"کیا....؟ اور وہ پیچھرے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ... غضب خدا کا، اتنا اندھیر پجا یا ہوا ہے ان اوگوں نے۔ ڈریھ روپیہ دے کر کام کرواتے ہیں اور آٹھ روپیہ لے کر بیٹھتے ہیں۔ حد ہوتی ہے ناجائز منافع خوری کی۔ کہتا تھا چار روپے مزدوری دیتا ہوں۔" مجھے تاؤ ہی تو آگیا۔

"ٹھیک کہتا ہو گا۔ پہلے اتنے ہی دیتا ہو گا۔ میں ستی پڑتی ہوں اس لیے کام مجھے مل گیا اور نہ میرا تو بھرہ بھی خاص نہ تھا اور شروع شروع میں ہاتھ میں صفائی بھی نہیں تھی۔"

"لیکن اب تو اسے ادا یا لگی ڈھنگ سے کرنا چاہیے۔"

"اگر ہم جیسی بے سماں ادا ہو ری تعلیم والی بجور اور ضرورت مند لڑکیوں کو ڈھنگ کے کام ملنا شروع ہو گئے تو بے ڈھنگے" کام کروانے کے لیے یہ کہاں جائیں گے۔" وہی کڑاہٹ ایک بار پھر اس کے لجھے میں گھلی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"اگر ہماری ضرورت میں گھر بیٹھے حلال کمائی سے پوری

ہوں۔"

جو ابا "اس نے اینا مختصر سا وجہ ذرا اور پرے سر کالیا۔

"لکشمی تک کے کتنے روپے؟"

"پینٹا لیس۔"

میں والٹ میں سے پیے نکالنے لگا۔

"سینے آپ کرتے کیا ہیں؟"

"فی الحال تو میں اے کے پیز دیے ہیں۔ اس کے علاوہ دو پھر سے شام تک انار کلی میں ایک دکان پر ہوتا ہوں۔"

"اس سے آپ کو بھیک نہماں تھواہ ماشی ہو گی؟"

"نہیں، آپ بھی خاص نہیں بلکہ جتنی سرکھپائی ہے اس کام میں۔ معاف پڑھ بھی نہیں، میں اسے چھوڑنے کی سوچ رہا ہوں۔ اسی لیے تین چار روزے گیا بھی نہیں۔ شاید آئندہ بھی جاؤں ہی نا۔"

"تو پھر آپ کو روپے یوں نہیں خرچ کرنے چاہئیں۔ جب تک دوسری ملازمت نہیں مل جاتی، تب تک بچا کر رکھیں۔"

"وہ تو سمجھو مل گئی... بس، میں روک دو۔" کرایہ رکھنے والے کو پکڑا کے میں وہیں اتر لیا تھا۔ یہ فائیواشار ہوٹل کی شاندار عمارت تھی۔



"دو بیڈ رومز اگ الگ مل رہے ہیں۔ روم نمبر ۳۷ اور روم نمبر ۱۹۔" میں نے فائیواشار کے ریسیشن سے معلومات لے کر نشی کو بتایا۔

"نہیں، مجھے سوٹ چاہیے یا پھر دونوں رومز ایک ساتھ تو ہوں۔ تمہیں پہاڑے میں بچوں سے اتنی دور نہیں رہ سکتی۔"

میں نے نشی کا تعارف کرتے ہوئے بتایا تھا انکے میری بیوی منہ میں سونے کا چمچے لے کر پیدا ہونے کے باوجود نہانے کہاں سے مل کا اس عورتوں تی چیند عادتیں خیڑالائی تھیں۔ بچے بے شک گورلس ہی پالتی تھیں مگر اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس کی نظریوں کے سامنے ہی رہیں۔ "پلیز نشی! اس وقت میں تمہاری پسند کے رومز تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ ویک اینڈ ہے، بھی ہونلز بک ہیں۔"

"تو تم بھی پہلے سے بنگ کر لیتے۔ پتا نہیں تمہیں کب اپی پوزیشن کو مسودہ کرنا آئے گا۔"

"مجھے تمہارے ساتھ آنے کا پتا نہیں تھا۔" میں صبر کے ساتھ اس کا طنزی گیا۔ "پلیز گزارا کرو۔ ویسے بھی تم نے کون سادن بھر بچوں کے ساتھ رہنا ہے۔ آج کاروں تمہارا پار لریں، شام اپنی فرینڈ کے ساتھ اور کل کا سارا دن فیشن شو کی نذر ہونے والا ہے۔"

"اوہ نہ! اس نے بڑے بخے کے ساتھ "گزارا" کرنے پر رضا مندی ظاہر کر کے میری ذات پر احسان کیا۔ "اب اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا بندہ اپنی میٹنگ اینڈ کرنے جا سکتا ہے؟" روم میں آکے میں نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔

"بالکل، بلکہ بندہ چاہے تو اپنی بندی کو ڈپلیکس تک لفت بھی دے سکتا ہے۔"

"ضرور دے سکتا ہے مگر بندے نے اپنی بندی کے لیے ایک کرو لا، رینڈ پر ہائز کی ہے۔ ابھی ایک گھنٹے تک تمہیں کال آجائے گی۔ سارا دن تمہارا ہے جہاں چاہو، جب چاہو، جا سکتی ہو۔"

"سو سویٹ ہنسی۔"

اسے بڑھانے کے بعد میں۔ فرقان بٹ کے دفتر کے لیے نکلا۔

"مس سونیا تو ڈیوس روڈ والے آفس میں ہوتی ہیں۔" وہاں سے اطلاع ملی۔

"اور یہ آفس کب بنایا....؟" میں نے جھنجلا کے دریافت کیا۔

"سرکاری کوئی تین چار ماہ قبل۔"

وہاں سے مکمل ایڈریس لے کے میں ڈیوس روڈ کی طرف مڑا، جو یہاں سے زیادہ فاصلے ہے تھا۔ ایمبیسڈر ہوٹل کے مقابل، ایک عالی شان بلڈنگ کے فریٹ نکور پر وہ آفس تھا۔ اور اس آفس کے ایک رِ تقیش قسم کے تیکین میں وہ بڑی مصروف سی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں جانتی تھی، تم آج کل میں لاہور آنے ہی والے ہو۔" اس نے ذرا ایک پیسوڑ سے توجہ ہٹا کے اپنی قیافہ شناسی کی را دھاہی۔

"تمہیں اب بھی میرے بارے میں الہام ہوتے ہیں؟"

"میری اردو ذرا کمزور ہے، میں نہیں جانتی، الہام کی تعریف کیا ہے، یہ دہم ہوتا ہے یا پھر.... پھر اور... ہاں اتنا

لاہور آیا ہوں اور اتفاق سے تمہارے بارے میں بھی پتا چل چکا ہے کہ تم آج کل کہاں ہو تو بغیر ملے واپس جانا زیادتی لگا، اس لیے انہیں پیسی میں چھوڑ کے سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں۔

”اچھا ہوا، تم انہیں پیسی لے گئے، تمہاری بھی پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی اس بمانے۔“

”شتاں اپ سکینہ! حد ہوتی ہے کسی بات کی۔“ میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

”سو نیا۔ میرا نام سو نیا ہے اور شاید تم بھول رہے ہو، تمہیں بھی میرا یہی نام زیادہ پسند تھا۔ تم مجھے سکینہ کہہ کر پکارنا پسند نہیں کرتے تھے۔“

”لیکن اب اسی نام سے پکار کے میں تمہیں تمہاری اوقات یاد دل رہا ہوں جو تم شاید بھول رہی ہو۔“

”نہیں.... نہیں ہارون صدر۔ میں اوقات بھولنے والوں میں سے نہیں۔ اس لیے کہ میری اوقات بدی ہی نہیں تو بھوالوں کیے۔ اوقات وہ بھول جاتے ہیں، جن کی اوقات بدی چکی ہو۔ جیسے کہ تمہاری۔“ اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کے مجھ پر نظریں جما کے کہا۔

میں اس کے لفظوں اس قبیلے نظرؤں کی تاب نہ لاسکا اور دہاں سے چپ چاپ نکل آیا۔

\* \* \*

سکینہ جاوید، ماسٹر فاقت حسین خان کی محنت کش، تلح مزاج اور معمولی سی حیثیت والی بیٹی۔

سو نیا، اپنی ماں کی سو نیا... جو ماں سے الگ ہو کے اپنی شاخست بنانے نکلی تھی مگر ماں کے دیے ہوئے نام کو ہی اپنا کریں۔

مجھ سے الگ ہونے کے بعد وہ اپنی ان پر انی یادوں سے بھی الگ ہو گئی جو اس کی پہچان تھیں۔ اب وہ نہ سکینہ تھی۔ نہ سو نیا بلکہ صرف سوہنی مگر پتا نہیں کیوں اسے وہ پہچان بھی رہا۔ اس نہ آسکی۔ ای وہ پھر سے سو نیا تھی۔ مگر میرے لیے وہ کل بھی ناقابل تحریر تھی آج اور بھی زیادہ ہو چکی تھی۔

”کیا چیز ہو تم سو نیا؟“ میں نے غصے سے اسیٹر نگ پر مکامرا۔

میں اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہا تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ جاننے کے بعد بھی کہ اس کے سامنے آتے ہی مجھے وہ باتیں

پتا ہے کہ اب بھی تمہارے بارے میں اکٹشاف ہوتے ہیں اور اتنی اردو تو آتی ہے مجھے کہ اکٹشاف ہمیشہ پچھی باتوں کے ہوتے ہیں۔“

میرے لبے لمبے سوالوں کے ”ہوں، ہاں“ پر منی مختصر جواب بکشکل دے پانے والی سکینہ جاوید اب میری سرسری سی بات کے جواب میں تمہیدی بیان داغ رہی تھی۔

”تم واقعی بدل گئی ہو یا بدل جانے کی اداکاری کر رہی ہو؟“

”مجھے چھوڑو، اپنی سناو، تم بھی کچھ مدلے ہو یا اب تک.....؟“ وہ اینہے والی ادھورا پھوڑ کے مسکرا نے لگی۔ وہی دل جلانے والی مسکراہٹ۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ اگرچہ اس سے جواب میں کچھ اچھا سانے کی توقع نہیں تھی، پھر بھی میں نے پوچھا۔

”میرا بصرہ حفظہ ہے۔ پھر بھی سکی۔ ابھی تو ملے ہو، اتنے عرصے بعد... کہیں دوبارہ...“ اس نے ہلکا ساق قہمہ لگایا۔

”تم نے شادی کی؟“

”میں، اس معاملے میں، میں خاصی بد قسمت ہوں۔“ اس نے سمجھ دی سے اعتراف کیا۔

”مجھے دوسروں کو والوں نہیں بنانا آتا، تمہاری طرح۔“

”کیا مطلب؟“ مجھے اُگ ہی تو لگ گئی۔

”مشلب صاف ہے۔ بھی کوئی الو کا پٹھا ہی ہو گا جو میری ساری رام کھانی سننے کے بعد مجھے سے بقا کی ہوش و حواس شادی کرے گا۔ کسی کی مت ماری گئی ہو گی جو...“

”مت تو میری بھی ماری گئی تھی۔ اسی لیے تم سے شادی کرنا چاہی تھی۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ہاں مگر کیا کرتی، میرا دماغ تو درست تھا۔“ اس نے شانہ اچھائے۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہارا دماغ کل بھی خراب تھا۔ آج مزید خراب ہو چکا ہے۔“

”تم اسلام آباد سے لاہور مجھے یہی بتانے آئے تھے؟“

”اس خوش فہمی سے نکل آؤ۔ ایکچھوئی میں اپنی فیملی کے ساتھ وزٹ پہ ہوں۔ نشی میری والف اور پچ میرے ساتھ ہیں۔“

”کہاں ہیں؟ مجھے تو نظر نہیں آرہے۔“ وہ بھولنے سے گردن اوپھی گر کے میرے عقب میں جھانکنے لگی۔

”میں پرانی دوستی کا لیٹا کر کے آگیا تھا۔ سوچا، عرصے بعد۔“

یاد آجائیں گی جو ہمارے الگ ہونے کا باعث بنیں، میں لاہور آیا۔ میں جانتا تھا ہمارا جب بھی سامنا ہوا، وہ تخت پھر سے تازہ ہو جائے گی، اس کے باوجود میں جان بوجھ کے اس کے سامنے آیا۔

کیا چاہتا تھا میں؟ کہ اتنابہ ہونے کے بعد بھی جب میں اس پے ملوں تو وہ بجھ سے اس طرح پیش آئے جیسے تب آتی تھی جب... جب ہماری شناسائی روستی میں بدل تھی۔



میرے اندر یہ درست تھے۔ ان چھٹیوں میں میں گھر گیا تو اپنے دبے دبے اور بھائیوں نے کھلے لفظوں میں مجھے یہ کافی اور پڑھائی کے چونچلے ترک کرنے کا مشورہ دے دیا۔ میرا میں اے کارز لٹ آچکا تھا۔ سینڈ ڈیوریشن کے ساتھ میں نے کریجویشن کی ذگری حاصل کر لیتھی اس بار کے لیے ریشمی جاپانی کرپ کے سوت، چھوٹے بھائیوں کے لیے پتلوں میں، لی شرٹس، بڑے بھائیوں کے لیے شلوار قیص کا کپڑا، ابا کے لیے پشاوری چپل اور ہندسوں والی گھڑی، کونکہ انہیں سویوں والی گھڑی سے وقت دیکھنا اب تک نہ آتا تھا۔ اماں کے لیے گرم سوت اور چادر، بچوں کے لیے کھلونے اور نافاں۔

”لگتا ہے نوکری اچھی ملی ہے، میرا میٹا افر لگ گیا ہے۔“

”ابھی کہاں ایسا چودہ جماعتیں پاس کر کے کوئی افسر نہیں لگ جاتا۔ یہ چھوٹی میوں نوکری تو بس خرچہ پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ تھے میں کئی زمینوں کی بچت کے بعد خرید پایا ہوں۔ اصل نوکری تو اب ملے کی جب میں سولہ جماعتیں پاس کر لوں گا۔ میں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔“

”ہیں....؟ دو سال اور....؟ بدھا ہو گیا ہے اب تو پھوڑ دے پڑھائی۔“ اپنے ناگواری سے کہا۔

”تعلیم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کیا قید“ اور میری عمر ہے ہی کیا؟ اکیس سال کا ہو جاؤں گا دو مہینے بعد۔ ”اپنے ذیلی ڈول سے بے شک میں پچیس چھیس سال کا بھر پور مرد نظر آتا تھا۔

”تیری عمر میں میرے دو بچے تھے۔“ میرے پاء جی نے

یاد دلایا تو میں نہیں پڑا۔

”اب ایس بات کا بدلہ آپ مجھ سے تونہ لیں۔“

”نہ کچھ شرم بھی نہیں آتی، اتنا بڑا ہو کے پڑھائیں کرتے ہوئے۔“ میری بڑی بھائی جو مزارج کی تیز اور زبان کی خاصی کڑوی تھیں، ہاتھ پنجائے کرنے لگیں۔

”بال بچے کی بات چھوڑ“ تیرے پاء جی تیرے سے نکل عمر میں سارے بیسر کی ذمہ داری اٹھا چکے تھے۔ راجا اور نورا بھی سولہواں پار کرتے ہی کماو ہو گئے، مرد کی شان اسی میں ہے کہ ہاتھ پیرزن کلتے ہی اپنے ہاتھوں پیروں کا استعمال کرے۔ کچھ غیرت نہیں آتی کہ چھ فٹا جوان ہو کے بھائیوں کی کمائی پہ پل رہا ہے۔“

”یہ ”پل رہا ہے“ سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں بھڑک اٹھا۔

”زمین ابا کی ہے اور مجھے انہی زمینوں کی کمائی سے خرچا جاتا ہے، جو میرا حق ہے۔“

”واہ.... اتنا پا کے حق کا؟ زمینوں کی آمدی پہ میرا حق ہے؟ زمینوں پہ کام کرنے میں بھی حصہ بٹا۔ کام کرتے ہوئے تو موت پڑتی ہے۔“ مجھ سے ایک سال بڑے نورے نے طنز کیا۔

”ہاں میں یہ کام نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے بس کا نہیں۔“ میں اپنا مختصر سافری بیگ اٹھا کے گھر اہو گیا، جبکہ مجھے آئے ابھی ڈریڈھ گھنٹہ ہی ہوا تھا۔

”نہ میں یہاں رہ سکتا ہوں۔ یہاں آتا ہوں صرف اپنے ابا اور اماں سے ملنے۔ اس سے آپ مجھے نہیں روک سکتے۔ ہاں اپنے شوہروں کو روک سکتی ہیں آپ مجھے میرا حق دینے سے۔ میں اس حق کے لیے مت نہیں کروں گا۔“ رہی میری تعلیم تو میں یہ مسئلہ خود حل کر لوں گا، دیے بھی پچھلے دو سال سے آپ کے بھیجے گئتی کے چند نوٹ میرے ایک ہفتے کے خرچے کے لیے بھی ناکافی ہوتے ہیں۔ کام تو میں دو سال سے کر رہا ہوں، اب اور ناکام لگا لوں گا۔“

میں کی بھی صورت لاہور نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے اونچی اڑان کی عادت پڑھلی تھی اور اپنے اس چک میں ساری زندگی گزارنے کا تصور ہی میری جان نکال رہتا تھا۔ میں نے لاہور میں رہنے کے لیے ہی ایم اے کا عذر تراشنا تھا اور نہ تعلیم میں میری دلچسپی اب واجبی ہی رہ گئی تھی۔ میری توجہ پھینکنے کے لیے لاہور شریں اور بہت سی رنگینیاں تھیں۔

ٹائپسٹ "آپ پر شروع ہر بنا میری منزل نہیں ہے۔ مجھے بہت آکے جانا ہے۔"

"اور مجھے بھی.... دیکھتے ہیں کون پلے پنچھا ہے۔"

"آپ کا سفر مجھ سے پہلے شروع ہوا ہے۔ کتنا ہی راستہ تو آپ نے طے بھی کر لیا، یقیناً آپ ہی پلے پنچھیں گے۔"  
"پہلے تو تم مجھے آپ کہنا چھوڑ دو۔ ہم دوست ہیں بھی۔"

"نہیں، ہم دوست نہیں ہیں۔" اس کے سرپلاک کے کھنپے میں نے چونکے دیکھا تو وہ وضاحت کرنے لگی۔

"دوستی کا راستہ برابر کا ہوتا ہے جبکہ ہم میں کوئی بھی برابری نہیں۔ میں آپ کو دیکھتی ہوں تو آپ مجھے بہت بلند بہت اونچے نظر آتے ہیں۔ اتنے احسان کر کے آپ نے مجھے زیریبارگر دیا ہے۔ اگر زندگی میں کبھی میں آپ کے احسان اتار کے آپ کے برابر ہو یا تو دوستی بھی کروں گی۔ فی الوقت تو میرے لیے آپ ایک دوست نہیں، محسن ہیں۔"

اس کا عقیدت سے چور لجہ سن کر میں گھبرا گیا۔ میں ایس پہ کوئی احسان وغیرہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور اس کے قریب آنے کا مجھے اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، سوائے اس کے کہ میں اس کی چند مشکلات ختم کرنے میں اس کی مدد کرتا۔

ماہر رفاقت حسین کو سرکاری ہاسپنل لے جا کر سارے میث وغیرہ کروانے اور مکمل چیک اپ کرنے جیسا مشکل اور وقت طلب کام.....

اسے ایک منگے بوتیک میں چاپ دلوانا۔

اس جاپ کے لیے زرا بہتر نسخہ کے لباس سلوانے میں اس کی مالی مدد کرنا۔ جو اس نے بستنال ناں کے بعد، قرض کے طور پر قبول کی تھی۔

اس کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کچھ اقدامات..... ہالی یہ سب میں نے کیا..... اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس کے قریب کیسے ہوتا، اس میں میرا اپنا مطلب اور غرض شامل تھی۔ لیکن وہ اسے میرا خلوص اور احسان سمجھ کے ممنون ہو رہی تھی۔

اس دن وہ بوتیک پہنچی جب مجھے اماں کی وفات کی خبر ملی۔ میں جانتا تھا اس بارگاؤں میں زیادہ ہی دن لگ جائیں گے۔ پہلے دل چاہا، بوتیک سے ہوتا ہوا جاؤں، اسے اطلاع دے دوں ورنہ اسے گلہ رہے گا۔ یوں بھی اس

"آج آپ کو میرا تعلیم حاصل کرنے بے کار لگ رہا ہے، فضول خرچی نظر آرہا ہے مگر کل آپ اپنے اسی بھائی..... اسی بے عیرت، کام چور اور مفت خور بھائی پہنچ کر گیں گے۔" میں نے چلنچ کرنے والے انداز میں کہہ کر مڑ کے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ یقیناً ان کا راجح پات ختم ہو چکا تھا۔ یہ بات ان اس کی سلسل خاموشی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

"نہ جا پڑو... گھر میں اونچ پیچ تو ہوتی رہتی ہے بھائیوں کے درمیان۔ سب تیرا بھلا چاہتے ہیں۔" ابا نے مجھے روکنے کی گزوری کو شش کی۔

"نہیں ابا جی! اس وقت میں نہیں رکوں گا، ہاں میں دوبارہ ضرور آؤں گا، آپ کو لینے کے لیے۔ اپنے شاندار گھر میں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے۔"

"رُک جانا..... تیری بے بے تیرے لیے گڑواںے چاول بنارہی ہے۔" ابا نے پھر روکنا چاہا۔ اماں میرے آتے ہی بڑے سے صحن کے اس پارچی جھمت کے نیچے بنے کھلے پادر جی خانے میں میری خاطر کرنے کے ارادے سے گھس گئی تھی اور اس ساری گرمائی سے بے نیاز میرے لیے گڑواںے چاول دم دے رہی تھی مگر اس سے ملے بغیر ہی میں گھر سے نقل کیا۔ جانتا تھا کہ اسے پتا چلا تو وہ مجھے روکنے کے لیے آنسوؤں کی جل تھل کر دے گی۔ مگر یہ نہ جانتا تھا کہ میرا جانا اسے اتنا برائی کا گا کہ وہ جان سے ہی گزر جائے گی۔ میرے لاہور پہنچنے کے بیس دن بعد مجھے اماں کی موت کی خبر ملی۔

ان بیس دنوں میں میں سیکنڈ کے خاصا قریب آچا تھا۔ وہ ہر دم شاکی رہنے والی اکھر مزانج کی لڑکی اب مجھ سے بہت سی باتیں کر لیتی تھیں۔ اب وہ میری مدد اور خلوص کو غلط معنی بھی نہیں پہناتی تھی۔ میں نے اسے ایک بوتیک میں سفارش کے ذریعے سیلز کرل بھی لگاؤ دیا تھا۔ یہ کام کم از کم لفافے بنانے اور جلدیں چڑھانے سے بہتر تھا۔ بے شک اس نے صرف دس جماعتیں پڑھ رکھی تھیں مگر مری کے کانونٹ میں گزارے پانچ سالوں نے اس کالب والجہ بہت اچھا اور انگریزی خاصی بہتر کر دی تھی۔ اوڑھ پس کے وہ کسی اچھے کانچ کی اسٹوڈنٹ لگتی۔

"تم پر ایویٹ طور پہ تعلیم جاری رکھو۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔

"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ یہ سیلز کرل کی جاپ یا

سے شادی کریں لی تھی تو اسے بدلنے کی کوشش تو کرتے۔ ہر عورت کی زندگی میں ایک سیاڑیہ وقت ضرور آتا ہے، جب وہ محبت کی خاطر سب کچھ نج دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ انہیں بھی تو محبت ہی ہوئی ہوگی جو انہوں نے ماشر رفاقت حسین خان جیسے کلاسیکل ٹنگرے شادی کی، ورنہ ان کے دلوں نے کم تونہ تھے۔ اگر ابو اس محبت کو ان کی کمزوری بنا لیتے، انہیں پابند کر دیتے، اپنے زورِ بازو پر بھروسا کر کے انہیں چار دیواری کے اندر عزت کی روئی دے دیاتے تو شاید آج لوگ بھول بھال گئے ہوتے کہ ماشر صاحب کی بیٹی کس قماش کی عورت کے بطن سے ہے مگر ایسا نہ ہوا کہ۔ انہیں عزت کی روئی کھلانا تو درکنار، انہوں نے اپنے حصے کی روئی کا زمہ بھی میری ماں پر لگادیا۔ کھانے والی عورت دبتی ہے، کھلانے والی نہیں۔ سو میری ماں شادی شدہ ہو کے اور ایک بیٹی کی ماں ہونے کے بعد بھی پرانی ڈگر پر چل پڑی۔ عجیب تفییات تھی میرے ابو کی بھی۔ انہیں چپڑی بھی چاہے ہی اور وہ بھی مفت کی.... اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتے تھے کہ یہوی جب "دیساڑی" لگا کے آئے تو سر تپا ایک فاشuar محبوبہ بھی نظر آئے۔ میری ماں کو ایسی کیا مجبوری لاحق تھی جو وہ یہ دہری زندگی جیتی۔ اپنا آبائی پیشہ بھی کرتی۔ اور شوہر کی خواہش کے مطابق ایک خاندانی مشرقي یہوی کے بھی سارے فرائض ادا کرتی سواس نے طلاق لے لی۔

میں تب کوئی آٹھ نوسال کی تھی۔ مجھے ماں نے مری کے بورڈنگ اسکول میں پہنچنا اور ایک طرح سے مجھ پر احسان ہی کیا۔ میں اس کے کوٹھے کے ماحول سے بھی نا آشنا رہی اور اس کے کراہیت بھرے روزگار سے بھی، حالانکہ بچپن میں ماں باپ کے جھگڑے سن سن کر تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ میڑک کے بعد میں واپس لا ہو ر آئی، میں کسی کام میں داخلہ لینے کے لیے۔ اب تک میری ماں نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا جس سے لگتا کہ وہ مجھے اپنے کام میں لانا چاہتی ہے بلکہ اس نے ہمیشہ میرے پڑھنے کے شوق کی حوصلہ افزائی کی مگر ہارون! مجھے یہ شوق راس نہ آیا۔ مری کے بورڈنگ میں ایک محدودی زندگی جیتی آئی تھی میں۔ یہ لا ہو ر تھا.... براشرا اور بڑے سائل.... ہونا تو یہ چاہیے کہ بڑے شروں میں لوگ بھیڑ میں ایک دسرے کے چرے بھی نہ یاد رکھ پائیں لیکن میرے ساتھ کیا ہوا کہ ہر دوسرا بندہ مجھے پہچانے لگا۔

وقت میں اکیلا تھا، بے حد اکیا اور اس خبر کو کسی کے ساتھ بانٹ کے اپنا غم بالا کرنا چاہتا تھا، کسی کے دامن سے اپنے آنسو خشک کرنا چاہتا تھا مگر میں وہاں نہ جاسکا۔ اگرچہ یہ چشمی مگر میں نے ہمیشہ یہ احتیاط کی کہ اس کے وہاں جانے کے بعد بوتیک جانا چھوڑ دیا ورنہ پہلے تو ہفتے میں دو تین چکرات تو میرے ضرور لگتے تھے اس بوتیک پر میں نے ماشر صاحب کو اپنے جانے کی وجہ بتائی۔ وہ خود بھی بست بیمار لگ رہے تھے۔

ماں کے دسوں سے فارغ ہو کے جب میں واپس لا ہو ر آیا تو مجھے راشد کانگری سے پہنچا۔  
"ماشر صاحب تیرے گاؤں جانے کے چوتھے دن" ہی ختم ہو گئے۔

"اور سیکنڈ؟"  
"اس کا پتا نہیں۔ ظاہر ہے یہاں اکیلی رہنے سے تو رہی۔ ہو سکتا ہے ماں لے گئی ہو۔"  
"ماں....؟ مگر وہ تو ماں کے ساتھ جانا گوا رہا نہیں کرتی۔"  
"مجبوڑی میں سب گوارا ہوتا ہے، وہاں ایک جوان ذیرے میں جہاں ہر قماش کا بندہ رہتا ہے، وہاں ایک جوان خوبصورت لڑکی کا اکیلے رہنا بھیڑوں کے غول میں اپنا آپ دینے کے متراوف ہے۔ اس سے کہیں محفوظ تو اس کی ماں کا نہ کہا جانا ہو گا۔"

"لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا کہ اس کی ماں کہاں رہتی ہے؟ میں سیکنڈ کو کہاں ڈھونڈوں گا۔" اصل فکر تو مجھے یہ تھی۔ اس نے صرف ایک بار اپنی ماں کے بارے میں بات کی تھی اور وہ بھی تب جب وہ اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے از حد پریشان تھی۔

"آپ کجھ رہے ہوں گے میں ایک مثالی بیٹی ہوں۔ مجھے اپنے ابو سے بہت محبت ہے..... مگر ہارون ایسا نہیں ہے۔ مجھے تو ان سے ٹھکٹھاک گلہ ہے کہ ایک تو معاشرے میں ان کی اپنی دیشیت بھی کوئی خاص قابل عزت نہیں تھی۔ سوتے یہ ساکر انہوں نے اپنی نسل چلانے کے لیے جس عورت کو منتخب کیا رہا ان تیسے تھی زیادہ تضییک کے مسخن خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ابو جی کو تو پھر بھی چند روشن خیال لوگ فنکار ہونے کی رعایت دے کر عزت کر لیتے ہوں گے مگر میری ماں.... ایک شکایت مجھے ابو سے یہ تھی ہے کہ انہوں نے اگر ایک ایسی عورت

بھی ضد ہے ہارون! چاہے اس سیل زدہ کوٹھری میں مجھے نی  
لی، ہی کیوں نہ ہو جائے، وہاں مڑکے نہیں دیکھنا۔ کیا یہ میرا  
قصورے کے میں ماشر رفاقت اور میڈم رانی کی بیٹی ہوں۔  
میں نے بھی قسم کھالی ہے کہ لوگوں کو یہ بھلاکے رہوں گی  
کہ میری جڑیں کماں سے نکلیں ہیں۔“

مجھے اس کی یہ ساری باتیں یاد آرہی تھیں اور میں یہ  
ماننے پر ہرگز تیار نہ تھا کہ وہ اپنی ماں کے پاس لوٹ گئی  
ہوگی۔ دوسری جانب راشد کی بات میں بھی دم نظر آ رہا تھا۔  
اجانک ایک خیال بخلی کی طرح ہنس میں کوندا۔

”بوتیک... وہ بوتیک تو جاتی ہی ہوگی۔ سوئی سے پتہ  
چل جائے گا۔“

”ہاں وہ میرے پاس آئی تھی، پورگرل... اس کے فادر  
کی ذیت ہے ہوچکی تھی اور کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا۔ ویسے تو  
مجھے سو شل درک کا خاص شوق نہیں، لیکن تمہاری وجہ  
سے، صرف اور صرف تمہاری وجہ سے سویٹ ہارٹ میں  
نے چند آدمیوں کو بھیج کر اس کی آخری رسومات وغیرہ  
کروائیں لیکن وہ تو چیزوں کم، ہی، ہو گئی رات کو پھر آگئی کہ مجھے  
بوتیک میں سونے کی اجازت دے دیں۔ کل کو کچھ اونچ پنج  
ہو جاتی تو؟ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے۔  
میری میڈ کے کوارٹر میں رہ لے۔ وہ بے چاری اکیلی عورت  
ہی ہے۔ پچھلے چار پانچ روز سے وہ وہیں رہ رہی ہے۔ کل  
سے اس کی طبیعت تھیک نہیں تھی، اس لیے آج وہ  
بوتیک پہ نہیں آئی۔ بھئی میں اسے مستقل تو اپنے گھر پہ  
نہیں رکھ سکتی۔ بتاؤ کیا کرنا ہے اس کا؟“

”میں کرتا ہوں کچھ، بس ایک دو دن اور پی۔“ میں وہاں  
سے کھسکنے کو تھا لیکن سوئی نے جو مہربانی کی تھی، وہ بار بار  
جتا ہے بغیر مجھے کیسے جانے دتی۔

”وائے ناٹ پینڈ سم، لیکن تم اس لڑکی کے لیے اتنا  
کنسنر کیوں ہو؟ سم تھنگ رانگ اور سم تھنگ  
اپیشل؟“

”تھنگ اپیشل سوئی! اس کے فادر کے مجھ پہ کچھ  
احسان تھے اس وجہ سے...“

”ہاں یہ تو میں مانتی ہوں کہ تم احسان فراموش نہیں  
ہو۔“ وہ بڑے خاص انداز میں مسکراہی۔ میں نے ٹھنڈی  
سائنس بھری۔ ابھی ابھی اس نے ایک احسان جتایا تو تھا۔

اس سے ملنے سے پہلے میں نے ایک درکنگ ویس  
ہائل میں اس کے رہنے کے چیدہ چیدہ انتظامات کیے جس

”ارے یہ.... اسے تو میں نے فلاں باٹی کے اڈے پر  
دیکھا تھا۔“ کسی سیلی کا بھائی پہچان لیتا۔

”یہ لڑکی جس گاڑی سے اتر رہی ہے، وہ میں روز بڑے  
بازار سے نکلتے دیکھتا ہوں۔“ کسی کاڈرا سیور انکشاف کرتا۔  
میری شرط پانچ ماہ میں ہی پورے کالج میں پھیل گئی۔

بس یہ پانچ میںے کافی تھے مجھے میری اوقات بتانے کے لیے  
اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ اپنی ماں کے سائے کے  
ساتھ میں جہاں جاؤں گی زلت اور بدناہی ہی پاؤں گی۔  
جاہے اس کے پیشے سے میرا تعلق ہو یا نہ ہو۔ میرے لاہور  
آنے کے بعد کئی مرتبہ ابو نے رابطہ کرنے کی کوشش کی  
تھی، مگر امی نے ایسا ہونے نہ دیا۔ پھر میں نے خود پیغام  
بھجوایا کہ وہ مجھے لینے جائیں۔“

”وہ آئے اور تم چلی گئیں..... کیا تمہاری امی نے ایسا  
اتنی ہی آسانی سے ہونے دیا۔“

”نہیں،“ مکر میں نے خود کشی کی دھمکی دی تھی ایک وجہ  
اور بھی تھی۔ وہ ایک نئی سُم سر کرنے جا رہی تھیں۔  
میرے مسئلے کو الجھا کر بڑھاوار یعنی کا وقت نہیں تھا، اس  
لیے کہہ گئیں کہ اگر نہیں گی بلکہ ہو سکتا ہے میری واپسی  
تک تمہارے سارے چاؤ پورے ہو چکے ہوں۔“ وہ  
دھیرے سے مسکرا دی۔

”لیعنی کہ نئی شادی.....؟“

”ہاں جاوید نامی شخص جس سے انہوں نے ابو سے  
طلاق لینے کے بعد شادی کی تھی اور جس نے ان کے کہنے  
پر مجھے قانونی طور پر اپنا کے مجھے اپنانام دیا تھا کہ ابو دوبارہ  
مجھے یہ دعوانہ کر سکیں۔ وہ میرے مری میں رہنے کے دوران  
ہی وفات پاچھا تھا۔ بے چاری کب تک اکیلی رہتیں۔“

”سنو،“ کیا تمہیں اندازہ تھا کہ یہاں زندگی اتنی مشکل  
ہو گی؟“ میں نے سیل زدہ دیواروں اور گھر کی اجری ہوئی  
حالت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”میری امی نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کے  
لیے اس سے بھی خوف ناک نقشہ کھینچتھے لیکن میں نے  
اسے مبالغہ آرائی کیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اصل  
صورت حال کا اندازہ ہوا۔ شروع کے دن واقعی میرے لیے  
بے حد اذیت ناک تھے۔ نہ بھوک برداشت کی جاتی تھی، نہ  
محنت کا یارا تھا۔ ہاں ایسے وقت میں وہ تذلیل بھرے  
نقرے یاد کر لیتی جو ماں کے پر تیش ساتھ میں سننے کو ملتے  
تھے، تب سائنس قدرے آسان ہو جاتی تھی۔ اب تو میری

سے پیچ نہیں کرتا، اس لیے انہوں نے مجھے سونیا کا نام دیا ہے اور میرے کا ونڈر پر بھی یہی نام لکھوا�ا ہے۔ میں کیے اعتراض کر سکتی ہوں۔ ان کے بوتینک کی حد تک مجھے سونیا بننے سے انکار نہیں لیکن مجھے یہ نام پسند نہیں۔“

”کیوں بھئی؟ اچھا بھلا تو ہے۔“

”لیکن مجھے یہ نام ان کی بیاد دلاتا ہے، میری ای کی۔ وہ بھی مجھے اسی نام سے پکارتی تھیں،“ اس لیے مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ آپ مجھے اس نام سے پکاریں۔ ایسا لگتا ہے یہ ان کاریا ہو انہم نہیں بلکہ ان کا دوالہ ہے۔“

”بے کار کی سوچ ہے، مجھے تو یہ نام پسند ہے اور میں تمہیں اسی نام سے پکاروں گا۔ تم بھول جاؤ کہ پہلے بھی کبھی کوئی نہیں اس نام سے پکار چکا ہے۔ بس یہ ذہن میں رکھو، یہ تمہاری نئی زندگی کا آغاز ہے۔ ایک خود مختار اور آزاد زندگی کا اور یہ نیا نام اس نئی زندگی میں تمہاری نئی پہچان۔“

اس نئی پہچان، اس نئے نام ”سونیا“ کو اس نے یوں اپنایا کہ ڈری سیکریٹری سوجوں والی، مر جھائے کملائے چہرے والی سیکنڈ جاوید کیسی پیچھے بست پیچھے رہ گئی۔ صرف پانچ ماہ میں انشتر کی تیاری کرنے کے باوجود اس کا رزلٹ بست ایجاد آیا۔ حالانکہ وہ ساتھ ساتھ بوتیک پر بھی کام کر رہی تھی اور کچھ کمپیوٹر کو رہ سز بھی۔ (میرے کہنے پر)

”یہ ایک این جی او کا کارڈ ہے، رکھ لو۔ اس اتوار کو چل جانا۔ ایک کمپیوٹر آپریٹر کی سیٹ خالی تھی۔ میں نے تمہارے لیے بات کی ہے، بس تم مل لینا۔“

اس کا رزلٹ نکلنے کے کچھ دن بعد میں نے اس سے کہا۔

این جی او سے شیلا کا خاصاً گرا تعلق تھا۔ میں نے اسی سے سونیا کی سفارش کی تھی اور میرا کہنا وہ کیے ٹال سکتی تھی۔

اس دوران میں بھی لکشمی سے نکل چکا تھا۔ البتہ راشد اب تک وہیں تھا۔ اصل میں، میں تو بست عرصہ پہلے ہی اپنے سب دوستوں سے دور ہو چکا تھا۔ ظاہری طور پر بھی اور زہنی طور پر بھی۔

میں.... ہاروں صفر تین سال پہلے جس کا تلفظ حدے زیادہ خراب تھا اور جس کی انگریزی تو دوسری کی بات جس کی گلابی اردو تک دوسروں کے لیے مذاق کی چیز تھی۔ اب ان

کی شہرت خاصی اچھی تھی۔ اس کے بعد اسے لینے آیا۔ ”تم چلو میرے ساتھ، ایک ہائل میں تمہارے رہنے کا انتظام ہو گیا ہے۔ کچھ پیپر درک کے لیے تمہارا جانا ضروری ہے۔“

”میں.... مگر میں ہائل کیسے انورڈ کر سکتی ہوں۔“

”یہ اتنا منگا نہیں، فی الحال میں نے تین مہینے کا ایڈوانس دے دیا ہے۔ تمہیں یکسوئی اور زہنی سکون کی ضرورت ہے۔ تین ماہ بعد انشتر کے ایگزامز سے فارغ ہو جاؤ تو میں تمہارے لیے کسی بستر جاب کا انتظام کرتا ہوں۔“

”آپ کی پی آربٹ اچھی ہے۔ کیا کام کرتے ہیں آپ؟“ یہ سوال وہ پہلے بھی کئی بار کر چکی تھی۔ ”یہی۔“ میں بہتر سامسکرا یا۔

”کیا مطلب؟“

”ولی آر یعنی پیلک ریشن۔“

”اوہ“ تب ہی....“

اس کے ہائل جانے کے بعد میں نے خود ہی اس سے ملنا زرا کم کر دیا۔ ایک تو میں چاہتا تھا کہ وہ پیپر زکی تیاری یکسوئی سے کرے، دوسرا میں اس سے بوتیک یہ جا کے ملنے سے احتراز بھی کیا کرتا تھا۔ پہلے تو ہماری چلتی پھر تے ”رام ایچل مینشن“ میں جی ملاقات اور باتیں چیت ہو جایا کرتی تھی۔ ہائل میں آئے دن جا کے ملنے سے اس پہنچا نام آنے کا اندیشہ تھا۔ جس چیز کے لیے وہ اتنی حساس تھی، یہ کیسے ممکن تھا کہ میں نہ ہوتا۔ میں ان تین ماہ میں بمشکل تین ہی بار اس سے ملنے ہائل کیا تھا کہ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو پہنچلے چل جائے۔ تیوں بار میں فروٹ، جو سل کے پیکٹ، بسکٹ کے ڈبے، بیم، کیچپ اور اسکواش کی بو تلمیں، ڈرائی فروٹ وغیرہ ساتھ لے کیا تھا۔ ”آپ یہ سب کیوں کرتے ہیں؟ پیکری مجھے اتنا زیر بارہ کریں۔“ وہ آبدیدہ ہو جاتی۔

”ضصول یا تیں مت کرو۔ بس کھاؤ، پیو، جان بناؤ۔ دیکھو سونیا اسحاق اچھی ہو گی تو پیپر زکی اپنے دے سکو گی۔“

”آپ بھی مجھے سونیا کہنے لگے ہیں۔“

”کیوں،“ تمہیں اچھا نہیں لگتا ہے سویٹ امیرا مطلب ہے مسز تشوری کے منہ سے تمہارا یہ نام سناتو مجھے اچھا لگا۔ سوچا آج سے تمہیں سونیا ہی کہ کے پکارا جائے۔ تم پہ بست سوٹ کرتا ہے۔“

”مسز تشوری کا کہنا ہے کہ میرا نام بست آٹ آف ریشنڈ

میں کسی معمول کی چیز کی طرح ہی اس محبت کو لے رہا تھا جیسے روز کھانا ہے، پینا ہے، رات کو سونا ہے، صبح کو جاؤ گنا ہے۔ اسی طرح سونیا سے بھی بس محبت کے جانا ہے۔ میرے دل میں بھی یہ وہم نہیں جا گا تھا کہ وہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے اور واقعی وہ کسی اور کی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ میں نے اسے اپنے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچنے سے کب ریا تھا۔ اس کی زندگی میں اور تھا ہی کون سوائے میرے۔

وہی کام کر رہی تھی ساتھ ہی روپرے شام تک جا بکرتی۔ اس کے پاس تو شاید کسی لڑکی سے بھی دوستی کرنے کا وقت نہ تھا، اس لیے میں مطمئن تھا۔ میری محبت چونکہ ہر طلب اور غرض سے بے نیاز تھی، اس لیے میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور اس کا مقصد کیا تھا۔ اس کی منزل کیا تھی، یہ میں حانتا تھا۔

وہ اعلاءِ علیم حاصل کر کے یا کسی اچھی سی حاب کے ذریعے اپنے قدم مضبوطی سے جانا چاہتی تھی۔ انی شاخت خود بنانا چاہتی تھی اور میں ایک اچھے دوست کی طرح اس کے مقصد کے حصول میں اس کی ہر ممکن مدد کر رہا تھا۔ اس سے شادی کرنا میرے لیے بہت آسان تھا، کون سی دیوار تھی بھلا راستے میں۔ کون تھا جو اعتراض کرتا۔ ایک لحاظ سے اب میں اس کا سرپرست تھا مگر میں نے اس مسئلے کو بست بعد کی بات بھتھتے ہوئے ”پھر سی“ پہنچا دیا تھا۔ اصل میں میں نہیں چاہتا تھا کہ میری زندگی میں آنے سے پہلے اس کی کوئی خواہش ادھوری رہ جائے یا وہ احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہو کے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام تو لے مگر بعد میں ساری عمر بخھے ہی اپنے مقصد کی ناکامی کا ذمہ دار سمجھتی رہے۔ اتناس بچھ کر رہا تھا اس کے لیے تو زرا سا انتظار نہیں کر سکتا تھا کیا؟ انتظاریں مناسب وقت کا انتظار.....



”اوہ پلیز نشی! میں کیا کروں گا یہ سل فیشن شو اینڈ کر کے۔“ میں باقاعدہ مزاحمت کر رہا تھا۔

”تم میرے ساتھ کہیں بھی آنا جانا پسند نہیں کرتے۔“ وہ روٹھ کئی اور یہ میں افروز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو راضی کرنا خاصاً منگا سو را تھا۔

”اوے کے لینیس گو۔“ میں بادل خواستہ اٹھا۔ وہ ایک

اردو میڈیم دوستوں سے کو سوں دور بھاگتا تھا۔

میرے سرکل میں اب سب برگر فرینڈز تھے جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ گلبرگ کے ایک درمیانے درجے کے ون یونٹ مگر خوبصورت اور ہر آسائش سے آر است فلیٹ میں رہتے ہوئے، میں لکشی کے اس گلے سڑے جس زدہ کمرے کو بالکل بھول چکا تھا۔ پہلی بار ایک سو بیس روپے کا پرفیوم لینے کے بعد اسے کنجوں کی طرح استعمال کرتے ہوئے ایک سال نکالنے والا صدر اب اٹرینی سے کم پہ بات ہی نہیں کرتا تھا۔ فٹ پاٹھ سے پندرہ روپے والی پی کیپ اور پیکیس روپے والا رہوپ کا چشمہ لینے والا صدر اب برانڈ چشمیوں کے علاوہ کچھ پسند نہیں کرتا تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ سب خرچے میں آخر پورے گماں سے کرتا تھا۔ بات یہ ہے کہ اپنے ان بے حد ذاتی خرچوں کے علاوہ اور میرا خرچا ہی کیا تھا۔ گھر سے تو میں تقریباً سارے ہی تعلقات ختم کر آیا تھا اور وہ جوابا سے بڑا اکڑ کے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن آپ کو لینے آؤں گا۔ اپنے بڑے سے بنگلے میں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے۔ وہ وعدہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اس کی نوبت تو ت آتی جب میں اس کے بارے میں سوچتا۔ کچھ بنانے کے لیے پہلے جو ڈنارڈا ہے اور میری ساری کمائیں ان ہی اللوں تللوں میں خرچ ہو رہی تھی جو اوروں کی نظر میں بے شک غیر ضروری اور فضول خرچی ہوں مگر میرے لیے بے حد ضروری تھے۔ میں اب جس سو سائی میں مود کر رہا ہوں، اس کے لیے میری پرنسل گرومنگ بہت ضروری تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا کام تو بالکل ٹھہپ ہو گیا ہوتا۔

سب کچھ بدل گیا تھا، نہیں بدی تھی تو بس ایک وہ بات....

میرے دل میں سونیا کے لیے جذبات...  
وہ اب بھی دیسے ہی مدھم مدھم مگر مستقل تھے۔ میں اسے پسند ہی نہیں بلکہ محبت بھی کر رہا تھا اور یہ بات پورے دل سے تسلیم کر دیکھا تھا سونیا ہی وہ واحد ہستی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا لیکن یہ محبت پائیدار اور مخلص ہونے کے باوجود مدھم مدھم سی اس لیے تھی کہ کبھی میرے دل میں یہ خواہش نہیں جا گئی کہ میں اس پہ اپنے دل کے جذبے آشکار کروں۔ اسے بتاؤں کہ وہ میرے لیے کیا ہے، اسے صرف اور صرف اپنا بنا لوں۔

خوبصورت اور پرکشش تو وہ ہمیشہ سے تھی، اسی لیے میں اتنا عرصہ اس کا اسیر رہا اگر اب تو اس کی چسب ہی نہیں تھی۔ مجھے ہمیشہ اس سے یہ گلہ رہا کہ اسے لباس پہننے کا سایقہ نہیں ہے مگر اب پچھلی دو ماہاتوں کے بعد اور آج اس کا نیا اور سجا جایا روپ دیکھنے کے بعد مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ غضب کی جامہ زیب ہو چکی ہے۔ شاید یہ ہنر بھی پہنچے کا ہی تھا۔ ایک وہ وقت تھا جب انی پہلی شخصوں سے شانگ کرنے کے بعد اس نے بھیکی پلکوں کے ساتھ اسے بتایا تھا۔

”آپ جانتے ہیں ہارون! پچھلی تین گرمیاں ایسی بھی گزری ہیں جن میں ضرورت کے باوجود موسم کے لحاظ سے ایک بھی گمراہ نہیں خرید سکی۔ وہ چند ہلکے لان کے سوت جو پسلے سے استعمال شدہ تھے اور جو میں اسی کی طرف سے آتے ہوئے لے آئی تھی، وہ بار بار دھلنے سے اتنے خراب اور بار بار یک ہو گئے تھے کہ باہر پہننے کے قابل نہ رہے تھے اور تب میں سخت گرمی میں بھی سردیوں کے کپڑے پہنے رہتی کہ بس حال وہ جلدی خراب نہیں ہوتے تھے۔“

اور اس وقت وہی بھیکی پلکوں اور ادا اس لمحے والی لڑکی، سلک کے بلیک ٹکنوں تک آتے گاؤں میں مبوس تھی جو یقیناً کسی اپنے ذیزانہ کا تیار کر رہا تھا اور اس کے مقابلہ فکر پہ بے حد بھلا بھی لگ رہا تھا۔ بلیک ڈریس میں اس کی دو دھیاناں میں سب کی توجہ کھینچ رہی تھیں اور کلامی میں جھولتا وہ نازک سا ہیرے جزا برسلت جو یقیناً فرقانیت یا کسی اور قدردان کی عنایت ہو گا۔ گرے گریان سے کسی راجہ نہ کی طرح نکتی شفاف لانی گردن۔ آج اس کے بال بڑے انوکھے انداز میں سیٹ کیے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ پسلے سے بھی نئی نئی لگ رہی تھی۔ میں اس کا جائزہ لینے میں پچھے اس طرح حکوم تھا کہ اس کے اس جانب پلٹنے پر سبھل کے رخ بھی نہیں پھیر سکا۔ مجھے دیکھ کے اس کے چہرے پر ایسے ناٹرات پیدا ہوئے جیسے کسی انتہائی بوریت کے عالم میں کوئی دلچسپ تماشا دیکھنے کو مل گیا ہو۔

میرے دامیں بامیں ہونے سے قبل ہی وہ سعیج کر چلتی ہوئی میرے قریب آنے لگی۔ اب میں غائب ہوتا بھی تو کہا۔

”تم.... یہاں بھی؟“

”تمہارے پیچے نہیں آیا۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”نه ہی مجھے تمہاری یہاں موجودگی کا پسلے

فاتحانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔ بس اس کی بست سی اچھی عادتوں میں ایک یہی بیات مجھے بری لگتی تھی۔ اس کا مجھے یوں دیکھنا جیسے کوئی فائع کسی مفتوح کو فخر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ کسی کو مغلوب کر دینے کا سرشار سا احساس اس کی مسکراہٹ میں تھا۔

میں خاصے بھے دل کے ساتھ نشی کے ہمراہ جانے پر تیار ہوا تھا۔ طبیعت پر یہ اضمحلال کچھ تو سونیا کے روئے کی وجہ سے چھاہا ہوا تھا اور پچھہ لا ہور آنے کے بعد ماضی کی یادیں بری طرح کچوکے دے رہی تھیں۔ ان ہی کچوکوں سے نکنے کی خاطر تو میں نے اسلام آباد سینیل ہونے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس شو میں آنے کے بعد مجھے طبیعت قدرے بثاشت کی جانب مائل ہوتی محسوس ہوئی۔ اچھی گیدرنگ تھی۔ میرا خیال تھا کہ خالصتاً ”فیشن“ کی ماری فارغ قسم کی عورتوں کی گیدرنگ بوجی گروہاں مجھے اپنے بزنس سرکل کے بست سے جانے پہنچنے چہرے نظر آئے۔ کچھ اپنے شوق سے آئے تھے اور پچھے میری طرح بیوپوں کے گھیر لھار کے لانے پر اور میری اچھی بھملی بحال ہوتی طبیعت پر یہاں کیک پھر سے وہی کوفت اور جھنجلاہٹ کے باول۔ چھتا گئے۔ جب میں اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر بلیک اسائنلش سوت میں اپنے آپ میں مگر کھڑی سونیا کو دیکھا۔ اس کی نظر شاید مجھے پر نہیں پڑی تھی۔ میں نے آہستگی کے ساتھ بست سی غیر محسوس طریقے سے نشی کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا جو بست دھیان سے اپنے سامنے کھڑی کسی پرانی دوست کی بات سن رہی تھی۔ وہاں سے ہٹ کے میں ٹھلتا ہوا اس دریخ سے سونیا کے قریب گیا کہ وہ میری نگاہوں کی زد میں تھی مگر میں اس کی نظر وہ اچھی۔ میں نے ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لینا چاہا۔

ڑیڈ یونین کی مینٹنگ میں یہ کسی بوتیک کا اچھا مگر سادہ سا کائن کا سوت پہنے ہوئے تھی۔ نظر کا خوبصورت چشمہ اور پیچھے کی جانب بندھے بال اسے سور ثابت کر رہے تھے تو ہلکا پھلا کا نفاست سے کیا گیا میک اپ اور باو قار انداز نشت و برخاست اس کی کرکش میں اضافہ کر رہے تھے اور جب میں اس سے ملنے اس کے آفس گیا تو بے شک وہ بست جھنجلاہی سی، تھکی تھکی سی لگ رہی تھی مگر اس سے اپنی کی شفہیت میں پیدا ہوتی خوبصورتی چھپ نہیں سکی تھی۔ وہ ہلکے رنگ ترے چکن کائن کے ہاف سلیویز والی شارٹ شرٹ اور ہم رنگ شلوار میں مبوس تھی۔

سے علم تھا۔"

کہ چلے جاؤ ہارون صدر! تم وہ نہیں جس کی مجھے ضرورت ہے۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہے اور جس چیز کی میری زندگی میں سب سے زیادہ کمی ہے، وہ کمی تم پورا کرنے کے قابل نہیں۔ مجھے سے ملنے تب آنا جب یہ ثابت کر سکو کہ تم اب میری ضرورت پوری کرنے کے قابل ہو، اس لیے سو نیا... صرف اس لیے میں آیا ہوں۔"

"میں نے اپنی ضرورتیں بوری کرنا سیکھ لی ہیں ہارون اور میری کمزوری بھی جو میں کسی کام سارا لے کر اپنے قدم جمانا چاہتی تھی۔ اب نہ تو میں کمزور رہی ہوں، نہ ہی کسی کی محتاج۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے سو نیا! مجھے تم آج... کل کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضرورت مند لگ رہی ہو۔ سارا تو آج بھی تم نے لے رکھا ہے فرقان بٹ کا۔ کیا میں تمہیں اس سے بہتر اور قابل عزت زندگی نہیں دے رہا تھا۔"

"اس سوال کا جواب بست تفصیل سے ریا جاسکتا ہے۔"

"میرے پاس کل بھی تمہارے لیے وقت ہی وقت تھا اور آج بھی۔"

"ہاں وقت ہی وقت، صرف اور صرف وقت۔" وہ پھر سے مسکرا نے لگی۔

"صرف وقت؟" میں نے زور دے کے پوچھا۔

"وہ ہے.... وہ یادیں....."

عاطف مائیک تھا میں نجانے کس کس کے دل میں بی چنگاریوں کو ہوا دے رہا تھا۔ مجھے بھی اپنے آس پاس رائک اڑتی نظر آئی۔

"بتاباً نا سو نیا! کیا صرف وقت...؟ اور وہ وقت کیا "صرف" کہلا یا جاسکتا ہے؟ تم مانو نہ مانو، میں آج کی بات نہیں کرتا مگر تب میرے پاس تمہارے لیے صرف چاہت تھی، اس کے سوا کچھ نہیں۔ بے لوث چاہت، بے غرض محبت۔ میں بنے تمہیں صرف وقت نہیں دیا تھا، اس دور کی اپنی ساری سانیں، سارے خواب، ساری زندگی دے دی تھی۔"

"وہ بھیکی بھیکی راتیں، وہ برساتیں۔"

پتا نہیں یہ مجھے سن رہی تھی یا گلوکار کو۔ پتا نہیں وہ میری بیانات تھیں یا اس کا گیت جس نے اس کے چہرے پر اس بھیکی شام کے سائے لرزائ کر دیے تھے، جو ہم نے کبھی اکٹھے گزاری تھی۔ وہ شام... جس میں میری بے پروا

ہونے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں ہوا کرتا تھا، تب بھی تو تم یہاں آتے تھے۔ دیکھیے میں یہاں مسز توریر کے انوائٹ کرنے پر آئی ہوں۔ ان کی ذریں کلیکشن بھی شامل ہے۔ مسز توریر... تمہاری سویٹ سویٹ... وہ مسکرا مسکرا کے مجھے بے حال کر رہی تھی۔ کئی سال ہماری شناسائی رہی مگر میں نے اسے پانچ دس منٹ کی گفتگو میں بھی اتنا زیادہ اور مسلسل مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کس پیچیز کا مزہ لے رہی تھی وہ۔ شاید سویٹ کے نام پر میری حق ہوتی رہ گلت کا۔

"دیکھے تو یہ سب میرے لیے بہت بونگ ہے مگر سویٹ کے ساتھ پرانے تعلقات کا لاحاظہ کر کے آگئی۔ تمہارے آنے کی وجہ بھی یہی ہوگی۔ آئی میں، وہی پرانے تعلقات۔" اب اس کی یہ مسکراہٹ ناقابل برداشت ہو گئی تھی میرے لیے۔

"فارگاؤں سیک سو نیا مجھے یاد نہیں کہ کبھی جانتے بوجھتے میں نے تمہارے ساتھ پنج براکرنا چاہیا، ہو یا دانتہ تمہیں چوٹ پہنچائی ہو، پھر کیوں تم مسلسل مجھے ایسے دے رہی ہو۔"

میں اس کے سامنے ٹوٹا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے دار ہی اتنے بھرپور تھے کہ میں خود کو اس کے سامنے بکھرنا سے روک نہیں سکا۔ میرے لمحے کی عاجزی اور بے بس نے اسے چپ کر دیا۔ وہ لب بخیچ کر سامنے ہونے والی رنگارنگ لارزوں دیکھنے لگی جس نے سارے لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھیچ رکھی تھی۔

"ہاں میں مانتا ہوں، میں لاہور صرف تمہارے لیے ہی آیا ہوں۔ تم سے ملنے، تم سے بات کرنے۔" اس کی خاموشی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

"اب ہمارے درمیان ہونے کے لیے کون سی بات رہ گئی ہے۔" سپاٹ لمحے میں کہہ کر اس نے ساری توجہ سامنے مرکوذ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ناکام اس لیے کہ اس کی ایک دم وریان ہوئی آنکھوں کے گوشے میں نے بھیکتے رکھے تھے۔ اس کے لب ہولے ہولے پھر پھر اڑ رہے تھے جیسے وہ اپنے اندر انھنے والے تلاطم کو روکنے میں سراسر ناکام ثابت ہو رہی ہو۔

"ہے... بات ہے سو نیا! یاد ہے آخری بار تم نے کہا تھا

سرسری ساختیل آیا تھا مگر صبح موسم دیکھ کے سوچا، اتنی بارش اور سردی میں شاید ہی کوئی اثر دیو کے لیے آئی ہو، اسی لیے اگر میں گئی تو جاب ملنے کے خاصے چانسز ہیں۔ ”اس نے سادگی سے بتایا۔

”پھر ملی؟“ میں نے بمشکل قہقہہ روکا۔

”نہیں۔“ اس نے مجھے ہوئے لمحے میں کہا۔ ”اور کیا تم کوئی گرم کپڑے نہیں پہن سکتی تھیں۔ کوئی شال، کوئی جیکٹ، جو گرز ہی پہن سکتیں۔ اتنی بارش میں ہیل والی سینڈل پہن کے نکلی ہو۔“ میں پھسل و سل جاتیں تو پستہ چل جاتا۔ پاؤں الگ برف ہو رہے ہوں گے۔“

”صرف پیر ہی نہیں بلکہ اس بائیک پر تو میری اپنی ہی قافی جنم گئی ہے۔“ اس کی آواز بھی کپکاری تھی۔ میں نے اپیڈ آہستہ کر لی۔ خود میں نے شرٹ کے اوپر ہائی نیک کے علاوہ لیدر جیکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ سرپہ گرم اونی نوپی تھی اور ہاتھوں میں دستانے، اس لیے پوری رفتار کے ساتھ اڑ رہا تھا۔ صرف میرے گالوں پر جو ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا، اس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس بے چاری کا کیا حال ہو گا۔

”مجھے کیا پتا تھا، سردی اتنی جلدی آئے گی۔ لا ہور میں جنوری آنے کے بعد زراسی جھلک رکھائی دیتی ہے سردیوں کی۔ سوچا تھا، دو چار لینٹن کے سوٹوں اور ایک آدھ سوٹر سے کام چل جائے گا، اسی لیے تو مصیبت لگ رہا ہے یہ موسم۔“

اس کی بات سن کر میں نے بائیک کا رخ جیل روڑے شارمن مارکیٹ کی طرف موڑ دیا۔

”چلو پھر سب سے کچھ شانگ کرتے ہیں۔“ میری جیب میں اس وقت پچھلے دیکھ اینڈ کی ساری کمالی ہزار ہزار کے چھ سات سوٹوں کی صورت جیب میں بھری تھی، اس لیے اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود میں نے فیاضی سے اس پر ہزاروں لٹائے۔

”آپ پلیز ایسے مت کیا کریں۔“ مجھے ایک کے بعد ایک عمده گرم کپڑے کا تھان کھلواتے دیکھ کے وہ بے بس سے بولی۔

”مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے، بہت عجیب لگتا ہے۔ آپ کے خلوص کے آگے بے بس ہو کے میں انکار بھی نہیں کر سکتی۔ یوں لگتا ہے جیسے انکار کر کے میں آپ کے خلوص کی توہین کی مرکب نہ ہو جاؤں مگر بعد میں یہ

سی محبت نجا نے کیے باغی ہو گئی اور اسے مانگ ٹھیکی۔ میرا سست ملنگ ساریں اس کا ساتھ طلب کر بیٹھا۔ ”حدا ہو گئے ہم، خفا ہو گئے ہم۔“ ”چلتی ہوں۔“ اس نے مجھے بغیر کہا تھا۔



میں اپنی بائیک پر یونیورسٹی سے واپس آریا تھا جب منی مارکیٹ کے بس اسٹاپ پر مجھے وہ کھڑی نظر آئی۔ تقریباً پوری سڑک دریان تھی۔ بارش اور وہ بھی سردیوں کی بھٹکا گون مزے لینے نکلتا ہے۔ وقت بھی دن کے گیارہ بجے کا تھا۔ شانگ کی ماری عورتیں اب تک اپنے دورے پر نہ نکلی تھیں، اس لیے بیشتر دکانیں بند تھیں۔ اگرچہ ساری رات کی طوفانی بارش کے بعد صبح سے ایک بوند بھی نہ پڑی تھی ایکن آسمان پر چھائے گئے سرمنٹی بادل، دور تک پھیلی دھنڈ اور ٹھنڈی سردی موسم کے تیور بتا رہی تھی، اس لیے کم ہی لوگ بغیر کسی اشد ضرورت کے باہر نکلے تھے۔ میں بھی سارا کیمس خالی دیکھ کے واپس اوت رہا تھا کہ راستے میں اسے پا کے حیران رہ گیا۔

اتنے سرد ترین موسم میں وہ لینٹن کے سوت چہلکا سا سو سٹرپنے کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبار کھٹے تھے اور باقاعدہ کپکارہ تھی۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“

میں نے اس کے بالکل نزدیک بائیک روکتے ہوئے پوچھا۔

”آپ...“ بائیک کے رکنے کی آواز پر یک ایک اس کے چہرے پر جو سرا سماں پیدا ہوئی تھی، وہ میری آواز نے دور کر دی۔

”پلیز مجھے ہائل سک چھوڑ دیجئے،“ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ نہ وین آرہی ہے، نہ ہی کوئی رکشہ نظر آیا ہے۔

”دیکھو۔“ موڑ سائیکل اسٹارٹ کرنے کے بعد میں نے پھر پوچھا۔ ”مگر تم اس وقت ہائل سے نکلیں کس لیے؟ پتہ نہیں تھا کہ موسم کتنا خراب ہے۔“ میں جانتا تھا کہ بی کام کے ہائل ایگز امزدے کر آج ٹکل وہ دن کو فارغ ہی ہوتی ہے، اس لیے کاچ کے لیے تو ہر کمز نہیں نکلی ہوگی۔

”میں اثر دیو دینے آئی تھی، یہاں ایک ٹریوں ایجنٹی میں دیکھنیسی خالی تھی۔ اشتہار پڑھ بکے بس یونی

ابھی تک وہ میری کمی بات کے سحر میں تھی اور میں تو جیسے وقتی طور پر بھول ہی گیا تھا کہ میں بے اختیاری میں کیا کہہ بیٹھا تھا۔

”کیا لوگی؟“ لمحہ کا وقت ہو چلا تھا۔ بارش بھی دوبارہ زور دشور سے شروع ہو چکی تھی، اس لیے میں اسے لے کر نزدیکی ریسُورٹ میں چلا آیا۔ موسم کی مناسبت سے میں نے چائینز کا انتخاب کیا تھا۔

”پچھے بھی۔“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی نیبل کی چکنی سطح پر پھیرتے ہوئے کہا۔ میں نے آرڈر دینے کے بعد دوبارہ اس کی جانب دیکھا۔ وہ اب تک اسی شغل میں مصروف تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے مضطرب ہاتھ پر رکھا۔ اس کی انگلیوں کی حرکت ہم کئی۔ دستانے سے اٹھا میرا ہاتھ بالکا نغم اور حدت آمیز تھا، جبکہ اس کا یا تھوڑا خاص اسرد تھا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے ساری کائنات ہم تھی گئی۔

”کیا تمہیں اب تک میری کمی بات کا تیقین سیں آیا؟“ کافی دری بعد میں نے سوال کیا۔ وہ پچھہ نہ بولی۔ ”کیا تمہیں کبھی ایسا نہیں لگا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، میرے کسی انداز سے، میری کمی بات سے۔“ وہ اُنھی میں سر بلانے لگی۔

”کمال ہے، نا ہے صنف نازک کی یہ حس خاصی تیز ہوتی ہے۔ وہ خود پہ پڑنے والی ہر نظر کا پیغام بھانپ لیتی ہے۔“

”ہاں لگا تھا، ایک بار نہیں کئی بار لگا تھا مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے، تب کی جب ہم لکشمی کے رام لعل میشن میں رہا کرتے تھے۔ تب بھی لگا تھا جب آپ میرا بھاری سامان اٹھا کے سیر ہیاں چڑھا کرتے تھے اور تب بھی جب مجھے دُگنی اجرت کا بتا کر خود اردو بازار لے گئے اور خاص طور پر تب، جب آپ بے انتہا بور ہونے کے باوجود میرے ابو کے پاس گھنٹوں بیٹھے ان کے ماضی کے یادگار واقعات سن کرتے تھے۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔

”لیکن میرا یہ شک آہستہ آہستہ خود ہی دم توڑ گیا۔ میں سوچتی تھی کوئی ایسے ہی کسی کے لیے اپنا وقت بریاد نہیں کرتا۔ یوں کسی تو کسی کے پیچھے نہیں آتا، ضرور آپ کا کوئی مطلب ہو گایا پھر کوئی جاہ... لیکن ایک عرصہ بیت گیا، نہ آپ نے کوئی مطلب نکالنا چاہا، نہ ہی جاہ جتا۔“ تب میں نے از خود یہ فرض کر لیا کہ دنیا میں اکاڑ کا ہی سی گرا یے بھی نوگ ہیں جو شو قیہ دوپرلوں کے لیے اپنا وقت اور پیسہ بریاد

احساس رہتا ہے کہ میرا اتنا حق نہیں جتنا آپ نواز رہے ہیں۔ انسانی ہمدردی یا خدا تری کے نام پر آپ نے میری جو مدد کی، وہ قبول کرنا میری مجبوری تھی بلکہ ایک لحاظ سے میرا حق۔ میری جو حالت تھی، اس میں مجھے صدقہ، خیرات اور زکاۃ لینا بھی جائز تھا۔ یعنی اب اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنا بوجہ اٹھانے کے قابل ہو گئی ہوں، اس لیے پلیز ہاروں! آپ اپنی نواز شات میں پچھے کی کر دیں۔“

ایک منگ شوانہر کے آگے میں نے بائیک روکی تو وہ دھیمی آواز میں مجھے سے التباہ کرنے لگی۔

”نواز شات..... بے وقوف لڑکا! میری محبت کو تم اب تک ہمدردی اور خدا تری سمجھ رہتی ہو، کس تدریسوں معقل بے تمہاری۔ ایک عاشق کا اپنی محبوہ کو تحفہ دینا تمہارے نزدیک مالی امدادت....؟“

میں پہنچ کارتے ہوئے لجھے میں، لعنتِ ملامت کرنے کے سے انداز میں اس پر اپنی محبت ظاہر کر رہا تھا۔ ٹھیب اظہارِ محبت تھا یہ بھی۔ کب سے میں نے اس خوبصورت جذبے کو دل میں پھیل کھانا تھا۔ کسی اچھے وقت میں، اپنے انداز میں ظاہر کرنے کے لیے اور کہا بھی تو کب جب وہ پچھڑ بھری سڑک پر شلوار کے پانچھے ذرا سا اٹھا کے سردی سے نلے ہوتے ہوئے اور سرخ ہوتی ناک کے ساتھ بھیگی مرغی بنی کھڑی تھی اور میں... میرا ایک پیر زمین پر اور دوسرا ابھی تک بائیک کے اسٹینڈ پر تھا۔

”جیا!“ بے حد حیران پریشان ہوتے ہوئے وہ میری طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ میری آواز اتنی بلند تھی کہ پاس سے گزرتی دواریاں ٹھنک کر رہ گئیں۔ بھرے والا نو عمر لڑکا جو اپنی دیواری لگانے میرے ہی پاس آ رہا تھا، دانت نکال کر رہ گیا۔ مجھے خود اس پھویشن یہ نہیں آگئی۔

”چلو اندر۔“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کے ہلایا وہ جیسے یکتے سے نکل آئی۔ البتہ اب بھی وہ پچھہ بولنے کے قابل نہ تھی۔ اس کا فائدہ میں نے یوں اٹھایا کہ بغیر اس کے کسی اعتراض یا مداخلت کے اس کے لیے امپورڈ جو گرز، کینوس شوز اور دو اسائیلش سی سینڈ لز خرید ڈالیں۔ وہاں سے نکل کے میں ساتھ دالے اسٹور میں گھس گیا۔ دو تین لکڑز کی خوبصورت گرم شالیں، جریاں اور ایک میرون اور براؤن کبی نیشن کی خوبصورت جیکٹ۔ اس کے بعد اگلے اسٹور سے شولڈر بیگ، پرنسیم اور چند کاس میں کس..... وہ کسی معمول کی طرح میرے ساتھ سا باتھ گئی رہی۔ یقیناً

”ہاں کل پھر...“ میں نے اس کی کسی قسم کی پس وپیش سے پہلے ہی فیصلہ کرنے لجئے میں کہہ دیا۔



”آج کا سارا دن تمہارے ساتھ گزاروں گا۔“ اب گلے دن اسے ہائل سے چک کرتے ہی میں نے کہہ ڈالا۔

”اور شام کو آفس کون جائے گا،“ مزمنتی خاصی سخت مزاج قسم کی خاتون ہیں ایک بات اور ہماروں بیٹا نہیں آپ نے کس کی سفارش کروائی کہ وہ دباو میں آگر مجھے اپنے تو کر جی پھیں مگر اکثر ہی مجھے سفارشی اور نااہل ہونے کا رابا ربا طعنہ دے مارتی ہیں حالانکہ میں اپنی بساط سے بڑھ کے محنت کرتی ہوں، لیکن وہ ہیں کہ خوش ہی نہیں ہوتیں۔“

”دفع کو اس کو دیے یہ این جی اوس کے بات کی تو ہے نہیں۔ اور زیادہ تپ اسے اس بات کی چڑھتی ہو گی کہ اس نے اپنی کسی ہوتی سوتی کو رکھانا ہو گا اس سیٹ پر،“ زیادہ ٹنگ کرے تو تری لگادینا کہ جس کے کہنے پر میں یہاں آئی ہوں، اس کے ایک اشارے پر آپ بھی یہاں سے رخصت ہو سکتی ہیں۔“

”توبہ کریں، میں اور یہ کہوں؟ آخر وہ میری باس ہیں۔“ وہ میرے مشورے پر گھبرا گئی۔

”تم اس این جی او کی ملازم ہو اور اس کی کرتا ہر تایہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ ویسے بھی ڈونز کا زیادہ عمل داخل ہوتا ہے،“ این جی او کی سب سے فارغ اور بے کار ہستی کو ہی سب سے اوپر پوست دی جاتی ہے ورنہ ان بڑی بڑی بیکھات کے پاس کہاں استا وقت کہ وہ دن میں بارہ گھنٹے ایک کریک پر بیٹھے بیٹھے فضول کے مسلوں میں سر کھیاتے ہوئے گزاریں۔ تمہیں اس سے خوفزدہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ وہ محض ایک کٹھ پلی ہے۔ میں ابھی شیلا کو کہوں تو...“ تیخی میں آکے شاید میں زیادہ ہی بولنے جا رہا تھا کہ اچانک احساس ہونے پر چپ کر گیا۔

”یہ شیلا کون ہے؟“

”میرے.... میرے ایک دوست کی آٹی ہے۔“

”آٹی! اور آپ نام لے رہے ہیں؟“

”یارا یہ ہمارے جیسوں کی آٹی نہیں جو ایسے احترام والے خطاب پر پھولے نہ سما کرف مجھے بیٹا کہہ ڈالیں۔“ مانند کر جاتی ہیں یہ لیڈریں... اگر انہیں ان کی عمر کا احساس دلا کر آٹی وغیرہ کہا جائے وہ اس این جی او کی سب سے اہم

کرتے ہیں۔ میں ضرورت مند تھی، تنا تھی۔ آپ کو اللہ کی جانب سے اپنے لیے بھیجی کوئی مدد بھی کے آپ کا ہر احسان لیتی رہی۔ اب تو میں نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں اور آپ.... آپ اب یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ.... آپ مجھے.....“

”ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں،“ اس وقت سے جب سے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے۔ رہایہ سوال کہ کبھی تم پر اپنی محبت ظاہر کیوں نہیں کی تو سو نیا! اتنے عرصے سے اور میں کیا کر رہا ہوں۔ کسی کے لیے اپنی بھروسہ توجہ لگاؤ اور اس کے درد کو اپنا سمجھنا، اس کی ہر کمزوری کو اپنانا، اس کی ہر خواہش کے پورا ہونے میں اس کی مدد کرنا۔

کیا یہ محبت نہیں؟“

”ہو سکتا ہے،“ شاید میرے پاس ہی محبت کو پہچاننے والی نظر نہیں۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”یعنی یہ بھی اب مجھے ہی سکھانا پڑے گا۔“

”وقت سب سے بڑا استاد ہوتا ہے مگر میرے استاد بھی آپ ہیں،“ رہبر بھی آپ.... سب ہی پچھے آپ سے ہی سیکھا ہے، محبت کرنا بھی آپ ہی سکھا رہتے ہیں۔“ لرزتی پلکوں کے ساتھ اس نے شریکیں لجئے میں کہا اور مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا جو میں ابھی کرنے ہی والا تھا۔

چیز اور کافی لینے کے بعد جب ہم وہاں سے نکلے تو دوسرے کے ساز ہے تین، ہو رہے تھے۔ رسیور نٹ میں گزار اور ٹڑھ گھنٹہ بڑا جل تھیں سا گزر اتھا۔ باہر بھی اور اندر بھی۔ اندر میں نے وہ ساری شد تیں وہ ساری چاہیں اس پر موسلا دھار بر سادی تھیں جو اتنے عرصے سے اپنے دل میں بادلوں کی طرح اٹھائے چلا آ رہا تھا اور باہر آ سماں نے اپنا سارا کٹورا زمین پر الٹ دیا تھا۔ اب وہ دھلادھلایا شفاف سا مسکرا رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میرا دل۔

”سنو، کل پھر ماؤگی؟“ ہائل کے گیٹ پر اسے اتارتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”کل پھر؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ عموماً ”ہماری“ مہنے میں ایک آدھ بار ہی ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ بھی بکشکل میں پچیس منٹ کی۔ بے حد رسمی سی۔ ”کیسی ہو،“ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں“ اور ”کوئی مسئلہ ہو تو بتاریں“ قسم کی ملاقاتیں لیکن آج کا نشہ سرچڑھ کے بول رہا تھا۔ اس کے گندمی چھرے پر اتری دھنک پلکوں پر اتار لینے کو جی چاہ رہا تھا۔

ڈوڑھے۔

”جو بھی ہے کام تو کام ہوتا ہے اور اگر کرنا ہی ہے تو پھر دیانت داری سے کرنا چاہیے آپ پلیز مجھے وقت پر آنس پسچاڑ تھے گا اور کیا آپ تو آنس میں جانا؟“

”نہیں.... میرا آج آف ہے۔“

”آپ کا آفس کہاں ہے؟“

یہ اس کا آخری سوال تھا جس پر میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے جھٹکے سے بایک روکی۔ یہ ایک مصروف شاہراہ تھی۔ آس پاس ریفک روائی دوں تھیں۔

”میرا خیال ہے ہم ہفتے میں ایک آدھ بار ملتے تو اچھا رہتا۔“ میری حفلی پر وہ سر اسی سر ہو گئی اور گھبرا کے بایک سے اتر گئی۔

”ہارون.... میں.... میں تو...“

”پار میں نے اسے کام کا کبڑا کر کے تمہیں اس لیے ساتھ میں لیا کہ تم تقییش قسم کا انٹرو یو کرنا شروع کر دو۔ اچھا بتاؤ کیا کرو گی آس کا ایڈریس جان کر میری کمپلین درج کر دو گی کہ آپ کا ایک سپالائی کام کرنے کے بجائے ایک اڑکی کے ساتھ ڈیٹ مار رہا ہے۔“

اس کے اڑے اڑے چھرتے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”نارا غش کیوں ہوتے ہیں۔ میں تو بس یونہی۔ اچھا بچھے نہیں کہتی۔“

”لو... یہ نئی مصیبت کہنا کیوں نہیں؟ کہو۔“ اس کی گھبراہٹ سے مزہ اٹھاتے ہوئے میں نے درشت انداز میں ڈپٹا۔

”میک... کیا کہو؟“ وہ میری اداکاری کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”آل او یو... کہو یہ کہو بھتی۔“ میں نے آنکھیں نکالیں۔ وہ منہ کھولے دیکھتی رہی تو میں مزید ضبط نہ کر سکا اور میرا اتفاقہ ابل پڑا۔

”کمال کرتے ہیں ہارون!“ کوئی جگہ ہے۔“ اس نے آس پاس نظر دوڑاتے ہوئے مجھے پھویشن کا احساس دلانا چاہا۔ بھتی ریفک میں میں اسے کھڑا کر کے عجیب فرمائش کر رہا تھا۔

”تو چلاو آؤ پھر... کوئی ڈھنگ کی جگہ نلاشتے ہیں۔“



”لاہور بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے؟“ نشی نے ناک

چڑھا کے کہا۔

”دو چاروں کی بات اور ہے لیکن اگر مجھے وہاں مستقل رہنا پڑے تو... اف عذاب ہی ہے۔ وہاں کا شور شرایا، غل غپاڑا اور خاص طور پر آلوگی ہمارے لیے تو اسلام آباد، ہی اچھا ہے، اپنای پر سکون صاف تھرا شر۔“

”تو تمہیں کون کہہ رہا ہے لاہور میں رہنے کو۔ کس کی جرات ہوئی کہ تمہیں مشورہ دے۔“ میں نے اس بے وقت کی راگنی کی وجہ جاننا چاہی۔

”ویسے ہی خیال آیا تھا۔ میں تو دو تین دن میں فیڈ اپ ہو گئی تھی۔ گھومنے پھر نے کھانے پینے کے لیے اچھا ہے۔ ایسا لکھتا ہے کسی فیشوں کی اوزٹ کر رہے ہیں لیکن مستقل رہنا، اماپبل۔ چند ایک اریاز کو چھوڑ کے باقی کس قدر گندے اور گنجان ہیں۔ ڈبیا جیسے مکان اوپر تلے اور ساتھ ساتھ بنے ہوئے۔“

”تمہاری آدھی زندگی آسٹریلیا اور لندن میں گزری ہے تو باقی آدھی.... بلکہ پچھلے کچھ سال اسلام آباد میں۔ بڑے شرسوں کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے تم نے توب تک اندر وہ شر کی ”کھڑی“ والی زندگی نہیں دیکھی، شکر کرو رہنہ ایک نظر ڈال کے ہی تمہارا ہارت نیل ہو جاتا۔ ایک ٹنگ سے چھوٹے چھوٹے کروں والے رانے خستہ حال سے مکان میں بہت سے خاندان ایک ایک گمراہ کرائے پہلے کر رہتے ہیں۔“

”ناوِ ڈونٹ نسل می کہ تم بھی اس ایڈو پنجرے سے گزر چکے ہو۔“

اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔ میں گھڑا کے رہ گیا۔ البتہ یہ تسلی ضرور ہوئی کہ اگر میں دوبارہ لاہور جانے کا پروگرام بناتا ہوں تو اُسی میرے ساتھ جانے کی ضد نہیں کرے گی۔ وہاں کی گرمی نے اس کا وہ حرث کیا تھا کہ اب میں نوں بلکہ سالوں وہ وہاں جانے کا نام لینے والی نہیں تھی۔ میرا اس بار کا دورہ تو ناکام ہی رہا۔ سو نیا سے دوبارہ ملاقات ہوئی لیکن بات نہ بن سکی۔

”کوئی سی بات؟“ میرے اندر سے سوال ابھرا۔

”واقعی..... سوچنے والی بات ہے آخر میں چاہتا کیا ہوں یعنی اس سے کیا چاہتا ہوں؟“ میں نے سنجیدگی سے غور کرنا چاہا۔

نشی سے میں پانچ سال پہلے ملا تھا اور اب تو ہماری شادی کو بھی چار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا تھا۔ اور ان چار

”ابھی کیوں نہیں۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”کیا کسی خاص گھری کا انتظار ہے۔ شادی والے دن کا۔“ میں نے چھپڑا توہ شرمائی۔ کہنے کو میں نے یہ بات بالکل بے ارادہ کہہ دالی تھی مگر کہنے کے بعد احساس ہوا کہ ہر لڑکی کی طرح اس نے بھی شادی کا خواب دیکھا ہوگا۔ کسی بھی لڑکی کے لیے محبت کی ساتھ شادی کا تصور لازم و ملزم ہوتا ہے۔ جبکہ اس سے قبل میرا دھیان ہی اس طرف نہ گیا تھا۔

”اے..... مجھ سے شادی کرو گی؟“

”اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔“ اس نے بے چارگی سے شانے اچکائے اور کھلاکھلا دی کے ہنس پڑی۔ میں نے پہلی بار اس کی کھلاکھلا رہتی سنی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری اس بات نے اسے کتنی بڑی خوشی بخشی تھی اور یہ اس کی آخری بخشی ہو میں نے یہی۔ اور وہ بات تو میں کبھی سن ہی نہ پایا جو سننے کی آرزو تھی۔ اس پے پلے ہی اس کی نفرت سامنے آگئی۔ جواب تک برقرار تھی۔ اس مستقل مزانج نفرت نے مجھے تملاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عرصے تک ممنونیت اور پچھاوار ہو جانے والی محبت دیکھی تھی۔ اب ان آنکھوں پر لپکے مارتی نفرت کی چنگاریاں میری برداشت سے باہر تھیں۔

کیا میں اس نفرت کو پھر سے محبت میں بدلا چاہتا تھا؟ کیا میں اب بھی اس سے وہ قین لفظی اقرار سننے کو ترپ رہا تھا جو اس نے زبان سے کبھی ادا نہیں کیا؟ کیا میں اس پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کی مجھ سے نفرت بے معنی ہے؟

آخر کیا چاہتا تھا میں جو بار بار اس سے دوبارہ ملنے کا خیال آتا ہے۔

”تمہارے سوال کا جواب بہت تفصیل سے دیا جاسکتا ہے۔“

اس کی بات یاد آئی تو میں وہ تفصیلی جواب سننے کو بے قرار ہو گیا۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ آخر کیا وجہ تھی جو اس کی نفرت کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ سب کچھ تو کیا میں نے وہ سب کچھ جو وہ چاہتی تھی۔ خود کو بدل ڈالا۔ ہر وہ بات ترک کر دی جیس پر ایسے اعتراض تھا۔ اب مجھے میں وہ ”وجہ“ کہاں باقی رہی تھی جس سے اسے نفرت تھی۔ پھر اب اس نفرت کی گنجائش....؟ اتنا پوچھنے کا حق تو تھا نہ مجھے۔

سالوں میں مجھے ایک بار بھی بھولے سے یہ خیال نہیں آیا کہ اس سے شادی کر کے میں نے ملطی کی ہو۔ اگر میں نے اپنے چک کی کسی پیتو، چھینو یا بانو سے شادی کی ہوتی تو اس کے نظر اٹھا کے دیکھنے ہے ہی شاید میرے اندر کا جس بیدار ہو جاتا۔ اور تو اور شر کی کسی اشیا سے کسی لکرک دغیرہ کی لڑکی میری بیوی ہوتی تب بھی اس کی بجائی ہوتی کہ وہ میرے سامنے اپنی آواز نکال سکے۔ لیکن یہ اُنہی تھیں میری لکشمی۔ وہ تو مجھے دن میں دو بار اٹھک بیٹھک بھی کرتی۔ کافی پکڑ کے ناک سے لکیرس بھی سکھنچپواتی بھگو بھگو کے جو تے مارتی تب بھی مجھے بسی خوشی منتظر تھا۔ لیکن صد شکر کہ وہ ایسی نہ تھی۔

اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ آنے میں جو کچھ ہوں صرف اس کی وجہ سے ہوں مگر خدمت تھا کہ وہ بات بے بات اس کا احساس مجھے نہیں دلاتی تھی۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا جو اس کا حق بھی بتاتا تھا۔ آخر وہ حصہ اسی تھی اُنہی تھیں ہیں ہمیں شک اس کی نظرت میں نہ تھا۔ آنے تک اس نے یہ پتا لگا نہ چاہتا تھا کہ نیس میں اس کی دلست اور اپنے اختیارات کا غلط فائدہ تو نہیں اخخارا۔ سب سیاہ و سفید کا مالک میں تھا، بُرنس کے معاٹے میں اس نے کبھی دخل نہ دیا تھا۔

دوسری جانب ہمارے ہمیں کے تعاقبات تھیں خوشگوار تھے، کسی فسم کی تشکل نہ تھی۔ میں اپنے زندگی سے ہر لحاظ سے مطمئن تھا مگر اس وقت تھے..... ذہب تک میرا سامنا سو نیا سے نیباڑہ نہیں ہوا تھا۔ جب میں اس سے الگ ہوا تھا تو ایسا رکھا جیسے میں نے زندگی میں اکر بھی کسی کو دوبارہ نہ دیکھنے کی خواہش کی تو وہ سو نیا ہی ہو گی۔ سلیمان جاوید... لیکن اسے میٹنگ میں پا کر ایسا رکھا جیسے وہ اتفاقاً نہیں ملی بلکہ میری ساماساں کی دعائیں رنگ لائی ہوں۔

اور جب سات آنھے سال کے وقف کے بعد بھی میں نے اس کی نفرت کو جوں کا توں پایا تو احساس ہوا کہ تشکل کیا ہوتی ہے، ”محرومی“ کے کہتے ہیں۔

”میں تم سے تب تک بات نہیں کروں گا جب تک تم مجھے یہ نہیں بتاؤں گی کہ تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو؟“ میں نے ایک بار منہ پھلاتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ کوئی بتانے والی بات ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ” وعدہ رہا،“ ایک نہ ایک دن ضرور بتاؤں گی، بس.... خوش۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”فرض کرو نہیں...!“ میں نے سنبھل کے ایک رنگ لینا چاہا۔

”فرض کرو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ تمہاری اس ستر خواجہ سے ایس نفیں، زبردست عورت سے میرا ماضی میں دھوادار قسم کا فشیر رہ چکا ہے تو پھر...؟“ میں نے بہت پہنچتے الفاظ میں کہا۔

”تو پھر...“ اس نے فلک شگاف تھقہ لگایا۔ ”تو پھر...“ یہ کہ اس بات پر سوائے تھقہ لگانے کے اوڑ کیا جا سکتا ہے۔ وہ تم سے کم از کم میں پچھس سال بڑی ہو گی۔ ”خیک ہے دیکھنے میں اتنی نہیں لگتی لیکن کل باتوں باتوں میں پا چلا کہ اس کی بڑی پوتی تک کی انگھٹ - ہو چکی ہے۔“ ”اس سے کیا فرق رہتا ہے۔ کیا کم عمر لڑکیاں اپنے سے بڑی عمر کے مردوں پر عاشق نہیں ہو جایا کرتیں۔ میں آج تیس سے کچھ اور ہوں تو کیا ہوا؟ اب بھی کوئی میں ایجاد... فرست ایکر فول آسانی سے مجھ پر فدا ہو سکتی ہے۔“

”یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اس پر تباہی سے تھے جب تم اپنی میں اتح میں تھے اور وہ بھی پوری طرح سے نہیں داخلی بھی۔“

”ہاں یہی سمجھ لو۔“ میں بھی زیادہ تفصیل میں نہیں گیا۔

”تو پھر میں تمہارے حسن ذوق کی داد ہی دے سکتی ہوں۔ بھی جو عورت فنی کراس کر جانے کے بعد بھی اتنی ”چیز“ نظر آتی ہے وہ کم عمری میں کیا قیامت لگتی ہو گی؟“ اس نے یا تو بات کوہنی میں اڑا دیا تھا یا پھر واقعی وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں اسے مزخواجہ سے برگشتہ کرنے کے لیے کوئی کہاںی گھر رہا ہوں۔

”اس آٹی کا کوئی اور علاج کرنا پڑے گا۔ ورنہ نہیں سے اس کے بڑھتے تعلقات کچھ اور رنگ نہ دکھادیں۔“ میں نے دل میں سوچا۔ ”اس آٹی چار سو بیس کی وجہ سے پہلے بھی ایک بار میری دنیا بنے سے پہلے اجزگئی تھی اب اپنے ہنستے ہنستے گھر کو اس کے سامنے سے دور رکھنا بہت ہی ضروری تھا۔“

\*\*\*

اس دن میں سونیا کو ڈرپر لے کے گیا تھا۔  
”وہ جو آپ کی آٹی ہیں نا...!“ شیلا۔

\*\*\*

”بچ ٹانائس لیڈی ہارون....“ نہی کے توصیفی بیان پر میں اپھل پڑا۔

”شادی کے سائز ہے چار سال بعد بھی تم مجھ پر لیڈی“ ہونے کا الزام لگا رہی ہو؟“ ”ربش....“ اس نے میرے مذاق پر سر جھٹکا۔ ”میں شیلا کی بات کر رہی ہوں، وہی مسز خواجہ تم تو یوں نہیں ان سے خار کھانے پڑتے ہو۔ بہت فناشک عورت ہے۔“

”کچھ زیادہ ہی.....“ میں بڑدا یا۔ ”جانو“ کیا میرے کہنے پر تم اس سے دور نہیں ہو سکتیں۔ ”میرے لمحے میں عاجزی بھی اور التجاہی۔“ اس سے پہلے میں نے بھی تمہارے سر کل اور کپڑی پر آرگو منش نہیں کیے مگر یہ عورت... شیلا واقعی تمہاری کلاس کی نہیں ہے۔“

”تمہیں کوئی مس اندر اشینڈنگ ہو لی ہے۔ تم اسے اپ کمنگ کہ رہے تھے جبکہ وہ تو بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔“

”اس کے خاندان کی تو...“ میں نے اچھی خاصی بھاری بھر کر کامیابی۔

”لینگوتھ پلینز...“ نہی کی ناک سکڑ گئی جیسے اسے گالی دیتے ہی میرے من سے بدبو کے بھکے آنے لگے ہوں۔ ”بھی بھی تم کر لئی بد زبانی کرتے ہو۔“

”اور بھی بھی تم لئی اذیل ہو جاتی ہو، کسی شوکی کی طرح۔“ یہ فقرہ میں نے دل ہی دل میں ادا کیا۔

”میرا خیال ہے کہ میں تمہاری مسز خواجہ سے ایک میشنگر رکھوا دیتی ہوں۔ کل ہم انہیں ڈرپر انوائش کرتے ہیں۔“ گھر پر نہیں، میری پیٹ میں، پھر تمہیں اندازہ ہو گا وہ لئی نہیں اور زبردست عورت ہے۔“

”زبردست تو وہ ہے۔ زبردستی بھی خوب کرنا جانتی ہے۔“ میں نے ایک بار پھر خود کامی کی۔

”کسی سے ملے بغیر اسے جانے پر کہے بغیر اس کے بارے میں رائے نہیں قائم کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ملنے کے بعد تم اسے پسند کرنے لگو گے۔“ اس کی پیشہن گوئی پر میں نے ترپ کے دیکھا۔

”اگر ایسا ممکن ہو تا تو یہ بہت پہلے ہو چکا ہوتا۔ وہ ان میں سے ہے، جن کو اگر آپ پسند کرتے تھی ہیں تو ملتے رہنے تھے یہ پسندیدگی اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔“

”میری آئٹی خوانخواہ میں ہونے لگی وہ میرے دوست کی آئٹی ہے۔“ میں واقعی برامان گیا۔

”ہاں کیا ہوا ہے اسے؟“ میں نے فرد سلااد کو بے دل سے پلیٹ میں پھینکا۔ میری آواز بھی اوپر جلوہ تھی، وہ سسٹم کے میرا غصے سے لال بھجو کا ہوتا چڑھ دیکھنے لگی۔ ریسٹورٹ کے نیم تاریک ماحول میں بستے سے لوگ میری جانب دیکھنے لگے۔ انہی میں ایک روزی بھی تھی۔ لاہور کی اس وقت کی مشہور یو میشن۔ اس کا پارلر خوب چلتا تھا سب سے منگا ہونے کے باوجود سب مشہور اپکٹر سزا اور ماڈلز اس کی روگولر کسٹر ز تھیں۔ بڑے بڑے فیشن میکر میز بھی اپنے شوٹ کے لیے اسی کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ وہ اپنی نیبل سے اٹھ کے میری جانب آگئی۔ میں سرپر ٹوٹی قیامت سے بے خبر ہر ان پریشان سی سونیا پہ اب تک اپنی ناراضی جتارہاتھا۔

”میں تمہیں یہاں اپنے لیے لے کے آتا ہوں۔ اپنی باتیں کرنے کچھ تمہاری سننے پہ کون کون سے لوگوں کو چیز میں لے آتی ہو۔ سارے رومالس کامزاگارت کر کے رکھ دیا۔“ میں اصل بات تو دبایا کہ مجھے تاؤ کس بات پہ آیا تھا۔

”ہائے رونی۔“ وہ لہراتی لچکتی، بغیر میری دعوت کے خود ہی برابر کی کری گھیٹ کے بیٹھے گئی۔ سونیا پہلے ہی میرے بگڑنے پہ ہکابکا سی تھی، اس بے تکلفانہ مد اخلاقت پہ اس کا رد عمل کچھ زیادہ ہی شدید ثابت ہوا۔ وہ کچھ ناگواری حیرت کے ساتھ اس پہ جانے پہچانے چرے کو دیکھنے لگی۔ یہ چالیس سالہ لمبی تر نگی عورت جو شر بھر کی عورتوں کو چند منٹ میں کسی اپرا کا ساروپ دینے کی صلاحیت رکھتی تھی اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی انگلیوں کی پوروں میں جادو ہے وہ یہ جادو بکھیرتی ہے اور ایک عالمی لڑکی کو سندھر لیا بنادیتی ہے۔ یہ عورت خود کسی تجھی قسم کی نسوائی کشش سے یکسر عاری سرپار رکھتی تھی، بد نما ہونٹ اور تنگ پیشانی کے ساتھ وہ قبول صورت بھی نہیں کھلائی جاسکتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی مہارت اپنے اوپر بھی آزماتی رہتی تھی۔ مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا سوائے اس کے کہ وہ یہ صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوفناک بھی لگنے لگتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے سانوں لے چرے پر گرے رنگ سجائے، موٹے ہونٹوں پہ میرون لپ اسک اور ان پہ سفید نبے دانتوں کی قطار کسی ڈیکوریشن پیس کی طرح سجائے میرے دل پہ اور میرے حواسوں پہ بلیاں کرنا۔ آخر وہ آپ کی ای کی عمر کی ہیں۔“

”میری آئٹی خوانخواہ میں ہونے لگی وہ میرے دوست کے ہاں کیا ہوا ہے اسے؟“ میں نے فرد سلااد کو بے دل سے پلیٹ میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ اس میڈے کی بوری میک اپ کے توارے کا ذکر سارا مزا خراب کر گیا تھا۔ ”وہ اس دن آفس آئی تھیں۔ یا نہیں کیوں میرے چھپے ڈر گئیں کہ مجھے ان کی ایڈورنائزنگ ایجنٹسی کے لیے ماڈنگ کرنی چاہیے۔ میں نے منع بھی کیا لیکن کل اور آج ملا کر ان کے چار قوں آئے۔ وہ بے حد اصرار کر رہی ہیں کوئی اور ہوتا تو سختی سے انکار کر کے چار باتیں بھی سناؤ اتی کہ جب میری مرضی نہیں تو کوئی زبردستی ہے کیا؟ لیکن سلسلہ یہ ہے کہ وہ وہی ہیں جن کی وجہ سے مجھے یہ جا بملی۔ آپ کی توان سے واقفیت ہے، آپ ہی مناسب الفاظ میں معذرت کر رہے میری جانب سے۔“

”وکرڈ الیار ایک آدھا اشتھار“ گیا فرق پڑتا ہے۔ ”میں نے زرا آزاد خیال بننے کی کوشش کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ حالانکہ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ لڑکی، جس سے میں شاری کرنا چاہتا ہوں، وہ ”اشٹھاری“ بن جائے۔

لیکن شاید میں اس کا رد عمل جانچنا چاہتا تھا۔ ”نہیں ہارون! میں یہ افورد نہیں کر سکتی۔ مانتی ہوں یا کہ آج کل اچھی فیملیز کی لڑکیاں اس جانب آ رہی ہیں مگر وہ فیملیز اتنی فیمس اور سوسائٹی میں اتنا ہائی اسٹینڈرڈ رکھتی ہیں کہ لوگ ان پہ انگلیاں انھانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ڈل کلاس یا الور کلاس سے شوبز کارخ کرنے والی لڑکیاں چاہے شوق کے ہاتھوں مجبور ہوں یا محض اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے کی خاطر اسے ایک رو فیشن سمجھ کے ہی یہ کام کرتی ہوں، معاشرہ انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ان پہ اس بازار سے تعلق رکھنے کا الزام لگتا ہے اور میں میں ہارون... میں تو... میرے ماضی کا ایک حوالہ تو ایسا ہے کہ مجھے اپنے آپ کو چھپانا ہے نہ کہ لائم لائٹ میں خود کو لا کر دو سروں کو یہ موقع دینا کہ وہ میرے بارے میں ہونج لگائیں۔ شہرت مجھے فائدہ نہیں، نقصان پہنچائے گی۔“ وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

”اوے کے.... میں سمجھا دوں گا شیلا کو۔“

”کتنا اگورڈ لگتا ہے اس طرح نام لینا۔ انہیں پسند نہیں کہ آپ انہیں آئٹی کہہ کے پکاریں تو آپ انہیں مزملک یا محترمہ صاحبہ دغیرہ کا لاحقہ لگا کر رہی پکار لیں۔ یوں شیلا

رہی تھی۔ جی باں سچ مج کی بجلیاں۔

"کہاں ہوتے ہو روئی ذیراً بڑی اوپنجی چیز ہو گئے ہو۔ اب تو کم ہی ہاتھ آتے ہو۔ اینڈ بائی رایوے۔ ان کی تعریف؟" اس کی نظر میں سونیا کو ٹھول رہی تھیں۔

"یہ سونیا ہے..... سونیا! میری طبیعت لمحک نہیں لگ رہی۔ میں جانا چاہتا ہوں، تمہارا دُن ہو گیا؟" میں یہاں سے کھکنے کو تھا جس کی وجہ صرف روزی تھی، مگر سونیا نے اسے بھی میری ناراضی سمجھا۔

"سونیا..... پریٹی نہیں... جست لا یک ہو..... کیا کرتی ہو بےی؟"

"میں جاب کرتی ہوں۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے نہ چاہتے ہوئے جواب دینا پڑا ہو۔ میں نے دیڑ کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں روزی بڑے تعجب کے ساتھ اپنا اگلا سوال کر چکی تھی۔

"جاب؟ کیسی جاب؟" وہ یقیناً سونیا کو کوئی توب چیز سمجھ رہی تھی۔ کسی صنعت کار، کسی بزنس میں کی بیٹی۔ اس وقت وہ میرا ہی گفت کیا ہوا ایک اچھے بوتیک کاؤنٹریں پہنے ہوئے تھی۔ نین نقش تو اس کے خوبصورت تھے، غربت اور جفا کسی کے اندر ہیروں سے نکلتے ہی اس کی ذات کی خود اعتمادی اور شخصیت کی کشش ابھر کے سامنے آئی تھی۔ وہ یورخ سے کسی اچھے گھرانے کی خوش باش دو شیزہ نظر آتی تھی، اسی لیے روزی کو اس بے جاب کرنے کا سن کر حیرت ہوئی ہوگی۔ مجھے دیڑ کی سستی پہ تاؤ آنے لگا۔ سونیا نے اپنی این جی او کا نام بتایا۔ روزی کی حیرت سوا ہو گئی۔ میں نے دیڑ کو اس جانب آتے دیکھا تو مل دیکھنے سے پہلے ہی والٹ نکال لیا اور اٹھ کھرا ہوا۔

"وہ تو شیلا کا..... امیز نگ..... دیری امیز نگ۔" وہ اپنے مدرنگ ریدے گھمانے لگی۔ اس کی اسی تھرا ایسی مسکراہٹ بھی مجھ پہ تو کبھی سونیا یہ پہسل رہی تھی۔ سونیا جو مجھے کھڑے ہوتے دیکھ کے بوکھلا کر خود بھی انھنے کو تھی، اس کے اگلے سوال پر آدمی کھڑی، آدمی بیٹھی رہ گئی۔

"شیلا اپنے ایمسلانز یا اتنی مہریاں کب سے ہو گئی۔ کیا اس نے تم سے کوئی کام نکالا تھا سونیا ذیر جو اتنی منگی رشت دی؟" یہ روزی کا سوال تھا۔

"لینس گو سونیا۔" میں نے بغیر گنے چند نوٹ نیبل پہ پھینکے اور اس کا ہاتھ تھام کے باہر نکلنا چاہا۔

"ایک منٹ روئی امفت میں کوئی مشورہ میں دیتی تو نہیں

مگر تمہارے لیے خصوصی طور پر ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ اپنے آپ کو اتنا ارزش نہ کرو۔ تم "کلاس" کا آخر ہو۔ اپنے آپ کو "کلاس" تک ہی محدود رکھو۔ ایسے تو تمہاری ہی ریپوٹیشن ڈاؤن ہو گی۔"

پتا نہیں وہ اور کیا بکواس کرتی مگر میں رکا ہی نہیں اور تیزی سے اسے لے کے ریسٹورٹ سے باہر نکل گیا۔

راستے بھروسہ چپ رہی، میں خود بھی چپ ہی رہا۔ یہ چپ ہم دونوں کے حق میں بہتر تھی۔ میں جانتا تھا اس وقت اس کے اندر بے شمار سوال ابھر رہے ہوں گے مگر میں اس کے کسی واضح سوال سے پہلے خود ہی وضاحت پیش کر کے "چور کی داڑھی میں تنکا" والی مثال سچ ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کل میں کسی بھی وقت شیلا صاحبہ سے بات کر لوں گا جا کر تم فکر مت کرنا۔" اسے ہائل کے گیٹ پر اتارتے ہوئے میں نے کہا۔ اس نے سر بلایا۔ وہ اب تک وہیں کھڑی تھی، صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ پچھے کہنا چاہ رہی ہے مگر کہہ نہیں پا رہی۔ میں نے اسے اسی تذبذب میں چھوڑ کر بائیک اسٹارٹ کی لیکن اس سے پہلے کہ میں آگے نکلا آخر کاروہ کہہ اڑھی۔

"سنیں..... وہ تھی کون؟"

"کون.....؟ وہ روزی؟" میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لئتے ہوئے پوچھا۔ "وہ روزی ہے۔ میرا تو خیال تھا تم جانتی ہو گی، اسی دنیا میں تو رہتی ہو۔"

"ہاں مگر..... وہ آپ کو کیسے جانتی ہے۔ اور عجیب عجیب سی باتیں کیوں کر رہی تھی؟"

"کیونکہ وہ ہے، ہی عجیب۔ رہا میرا سے جانے کا سوال تو تمہیں بتایا تو تھا کہ اپنے کام کے سلسلے میں مجھے ہر طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ یہ دیسے ہی پچھے ہٹکی ہوئی ہے، میں جب بھی اس سے ملا ہوں اسے ایسی ہی بیکلی بیکلی باتیں کرتے سنائے ہے۔ ہو سکتا ہے نشہ وغیرہ کرتی ہو۔ ہالی سوسائی کی ان عورتوں کا کیا پتا۔" میں نے جو اس وقت دل میں آیا، کہہ دیا۔ مقصد صرف اسے کسی طرح مطمئن کرنا تھا۔ وہ اچھی خاصی ذہن بھی مگر میں جانتا تھا کہ عشق اچھے بھلے آدمی کی مت مار رہتا ہے۔ وہ احتمق تھی تو نہیں لیکن اس شخص کے ہاتھوں آسانی سے احمق بن سکتی تھی جسے وہ دل و جان سے چاہتی ہو۔

"آپ... آپ جرنلٹ ہیں؟"

"وہاں میری بڑی اچھی فرینڈز کی گیدرنگ ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا کام بن جائے۔ تم جہاں کھو گے، اور جو بھی کام کھو گے وہ مل جائے گا۔"

میں فوراً "تیار ہو کے چل پڑا۔ جانتا تھا کہ شیلا کے حلقة احباب میں بڑی اہم پوسٹ پر تعینات آفیسرز بھی ہوتے ہیں اور ان کی بیکمات بھی۔ کسی کی بھی سفارش سے مجھے معقول قسم کی جاب مل سکتی تھی۔ کوشش کروں گا، لاہور سے باہر کمیں سیٹ ہو جاؤں۔

کراچی یا اسلام آباد۔" میں نے یہ بھی ارادہ کر لیا۔ وہاں میری توقع کے عین مطابق شرکی تقریباً "ساری کریم جمع تھی۔ سب ہی بیکمات تسلیما میں جی جان سے غرق تھیں۔ مجھے دیکھ کے شیلا والہانہ انداز میں میری جانب لپکی اور اس کے پیچھے بست سی نگاہوں نے میری طرف توجہ کی۔ کئی نگاہوں میں حسد، رشک اور رقابت تھی تو کئی میں ستائش اور طلب۔

ان ہی ڈھلتی عمر کی الزاماً بیکمات میں ایک سمزفتی بھی تھی۔ وہی سمزفتی جو سونیا کی نک چڑھی اور نکتہ چیس قسم کی بس تھی۔ اس کو دیکھ کے میں زراساکڑ بڑایا۔ مجھے یاد آیا کہ کل ہی تو سونیا نے ذکر کیا تھا کہ سمزفتی اسے اور اس کی دو اور کوئی لیکر کوکل کسی میٹنگ میں اپنے ساتھ بے جانا چاہتی ہیں۔ کمیں وہ میٹنگ یہی گیٹ ٹو گیدر تو نہیں۔ این جی اور کی فلاخ و بہود تو ایک بہانہ ہوتا ہے مل بیٹھنے کا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے خوف زدہ نظریں آس پاس دوڑا میں اور میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ ان بائی فائی پروفائل والی لیڈریز کی نیبل کے ذرا پرے۔ ایک اور نیبل پر دو تین در کرز لڑکیاں چند فالیں کھولے بیٹھی تھیں۔ جن میں سے ایک سونیا تھی۔ وہ بے یقین نگاہوں سے میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ ان نگاہوں میں صرف بے یقینی ہی نہیں تھی۔ اور بھی بست پکھ تھا جو میں سمجھ کے بھی سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ حیران ہو رہی ہو گی اور بس، یا پھر کل کی طرح کچھ سوالات سنگ کر رہے ہوں گے۔" میں نے اس "بست پکھ" کو جھلانا چاہا۔

"یہ رومنی ہے۔ میرا رومنی۔ شیلا کاردنی، مائے بوائے۔" وہ کسی جیتے ہوئے میڈل کی طرح مجھے اپنی بغل میں روپے اپنی فرینڈز سے میرا تعارف کر رہی تھی، میں نے چور انکروں سے ایک بار پھر اس نیبل اور اس کے گرد بیٹھے

"نہیں بھی۔" میں نے ایک بار پھر بائیک کو لگا کی۔

"تو پھر ان شور نس ایجنت... تب ہی اتنے بڑے بڑے اوگوں سے واپس ہیں۔" اس بارہہ پورے یقین سے کہنے لگی تو مجھے نہیں آگئی۔

"نہیں یا ر...! اللہ بچائے اس کام سے، بڑی خواری ہے، سنو کسی کو بتانا نہیں۔ میں اصل میں ایک جاسوس ہوں، اہم لوگوں کے اہم راز جرأت ہوں۔"

جائتے جاتے میں نے سراسر ایک مذاق کرنے کی کوشش بکی تھی۔ میرا خیال تھا میری طرح وہ بھی نہیں پڑے گی۔ مگر وہ یوں سریلانے لگی جیسے کوئی معہدہ حل ہو گیا ہو۔

اس وقت توبات مل گئی مگر رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر میں نے دیر تک سوچا۔

"اب وہ میری زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہے۔ میری شریک حیات بننے میری ہر چھوٹی بڑی بات میں ہر دکھ درد میں شامل ہونے والی ہے۔ آج جو سوال وہ تھا کہ کے پوچھ رہی ہے کل پورے اتحاق سے پوچھ رہی ہو گی اور یہ بھی چیز ہے کہ اپنی باقاعدہ اور منظم زندگی کا آغاز کرنے سے پہلے مجھے شجدگی سے لگے بندھے روزگار کا بندوبست کرنا ہو گا۔ کسی پکی مازمت کا اس ہواںی رزق کا کیا بھروسہ، آج ہزار تو کل دس روپے بھی نہیں۔ میری سفارش پر سونیا کو نوکری مل سکتی ہے تو خود مجھے کیوں نہیں۔ شیلا سے بات کروں تو وہ تو چھوٹتے ہی مجھے اپنی کمپنی کے لیے میٹنگ کی آفر کرے گی اور یہ کام میرے نہیں کا نہیں۔ کمپرے کو دیکھ کے ہی میرے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ اس کی خاصی پہنچ ہے، کسی نہ کسی پرائیوٹ فرم یا سرکاری و نیم سرکاری ادارے میں کھپا ہی دے گی۔ ہاں بس بست ہو گیا۔ اس طرح میں سونیا کے ساتھ ہر لمحے اس خوف کے سامنے میں زندگی نہیں گزار سکتا کہ کمیں اسے....."

میں نے واقعی دل و دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ اس رات اس دلدل سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مگر تقدیر کو میرا یہ فیصلہ پسند نہ آیا تھا۔ یا شاید اس قدر تاخیر کے کرنا پسند نہیں آیا تھا۔

اٹھے دن میری شیلا سے فون پر بات ہوئی تو اس نے مجھے جم خانہ کلب میں ہی بلوالیا۔

ساتھ مجھے اپنے مکروہ کھیل میں شامل کرنے والے تھے۔ شوہر کی رنگینیوں کا لامچ دے کر شیلا جیسی دو نمبر عورت کے باہم مجھے بیخنا چاہتے تھے۔

”دیا غیر خراب ہے تمہارا۔ کس نے یہ خناس بھرا ہے تمہارے اندر، میں تم سے محبت کرتا ہوں سونیا! اور شادی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہی بچ ہے اور یا تو سب بکواس۔ رہا شیلا کا مسئلہ تو میں نہیں جانتا اس نے تمہیں ماذنگ کی آفر کیا سوچ کر کی مگر اس سے میرا کیا تعلق؟ دیے بھی غلط ارادہ اس کا بھی کوئی نہیں ہو گا۔ اس کی ایڈور نائزنگ ایجنسی کا ایک نام ہے۔ ایک مقام ہے تمہیں تو کس نے کہ دیا کہ وہ لڑکیاں پہنچنے یا خریدنے کا کام کرتی ہے۔“

”ہاں شاید مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ وہ بھلا لڑکیاں پہنچنے کا کام کیوں کرنے لگی۔ وہ صرف لڑکے ہی خریدتی ہے۔ تمہارے جیسے ہندز سم ‘اسمارٹ’ گذلکنگ اور بے غیرت۔“ وہ چبا چبا کے بولی۔

”سونیا...“ میں دھماڑا مگر میری چنچ کھوکھلی تھی، جیسے جھوٹ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ خوف ہمیشہ کمزور ہوتا ہے۔

”کیوں غلط کہا میں نے؟ تم کیا سمجھتے تھے میں بھی نہ جان سکوں گی؟ تم اتنی آسانی سے میری آنکھوں میں دھول جھونک سکو گے۔ مگر ہارون صدر! میں نے زندگی میں کبھی کسی کابر انہیں کیا تو میرا رب میرے ساتھ برا کیسے ہونے دیتا۔ تمہاری اصلیت میرے سامنے کھل چکی ہے۔“

”ویکھو سونیا! تم غلط سمجھو.....“ میں نے اس کے ہاتھ تھامنے چاہے۔ مگر وہ تو جیسے کرنٹ کھا کے دور ہوئی۔

”ہاتھ مت لگانا مجھے ہارون! دور رہو مجھ سے۔ اپنے یہ کریہہ ہاتھ، یہ بکے ہوئے ہاتھ میرے وجود سے دور رکھنا۔“ میں نے اپنی ماں سے اپنی سگنی ماں سے ”خود کو جنم دینے والی ہستی سے یہ حق چھین لیا تھا کہ وہ مجھے چھو سکے۔ کیونکہ مجھے اس کے لئے کہا ہیت آتی تھی تو تمہیں کیسے برداشت کرلوں۔“ تم میں اور میری ماں میں فرق کیا ہے۔ وہ بھی سکے پھیلنے والوں کو ناج کے دکھاتی تھی، ادا میں پیچتی تھی اور تم..... تم بھی تو یہی کام کرتے ہو۔ طوائف کو تو پھر بھی مجبوری کا ٹیک لگا کر مظلوم ثابت کر دیا جاتا ہے تم کیا جواز پیش کر دے گے اپنے بکنے کا۔ چھی.... گھن آتی ہے مجھے یہ سوچ کر بھی کہ کبھی میں نے تم جیسے۔“ اس نے زمین کی طرف منہ کر کے تھوکا۔

”تم جیسے مرد سے محبت کی۔ جو مرد انگی کے نام پر ایک

لغوں کی جانب رکھا۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے پر کسی تماشے کو دیکھنے والی دلچسپی نہیں۔ وہ مسکرا مسکرا کے لطف اندوڑ ہو رہی تھیں۔

اور سونیا اس کی رنگت نظرناک حد تک سفید پرچکی تھی۔ مجھے سے اندریں ملنے پر جسے اس کے مروہ وجود میں ایک دم جان تی پڑ گئی۔ وہ ایک بچکے ساتھ اکٹھی اور تیز تیز لہ مول کے ساتھ پلتی ہوئی باہر لکھنی و قتی طور پر مجھے بان غاصبی ہوتے ہے احساس ہوا۔ میں قدرے مطمئن ہوئے اب، ہس بیٹھ پہنچا ہر میرا، حسیان بار بار بھلکے اسی جاہب چاہا بات تھا۔

وہ تھنکت اب ان ماہیوں سے بمشکل جان بچا کے دہائی سے انکا تھا میرا رنگریز بھاشاں کی جاہب تھا۔ راستے میں ایک جگہ رک کے بیٹھنے کا نون لیا۔

”میں تمہیں لینے آرہا ہو، تیار رہنا۔“ میں نے بڑے ہی مقول قسم سے بھاٹت تھی سوق لیتے تھے۔ ہر اس اعتراض کا جواب اور رواز تراش یا تھابوہ کر سکتی تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ اس کی سرد آواز کے چھینگوں نے میرا سر اندازی ختم کر دیا۔

”لیکھ؟“ میرکی رواز مہراں کی بھتی۔

”تمہیں تھیں جاہلی۔“

”مجھے تمہے تھے نصیر دری بات لرنا تھے۔“

”مجھے بھی، لیکن اس کے لیے ساتھ جانا ضروری نہیں۔ تم مجھے تھے زینانگ روم میں مل سکتے ہو۔“ اس نے نون بند کر دیا اور مجھے اس وقت ہسیان تکنے آیا کہ آج اس نے پہل بار مجھے ”آپ تکے بجاے“ تم کہ کے مخاطب کیا تھا۔

”سونیا! ایک بھی یہی کال میں تمہارے ہی سلسلے میں شیلا۔... آئی میں نہ ملک تھے ملنے والا تھا۔...“ میں نے اسے دیکھتے ہی صفائی پیش کرنا چاہی۔

”میرے سلسلے میں؟ میرے سلسلے میں کیوں؟ کیا تمہاری مارکیٹ، یا یو اب بالکل ختم ہو گئی ہے مسٹر ہارون صدر! جواب دوسروں کا سودا کرنے پر اتر آئے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

”اب میں کچھی کہ مجھے پر تمہاری نوازشات کا کیا مطلب تھا۔ مجھے اکیا، بے سارا مجھ کے میری مدد کرنے کے پیچے تمہارا کیا مقصد تھا۔ نہ ہمدردی نہ محبت صرف اور صرف میری مجبوریوں کا فائدہ اٹھانا۔ تم کس صفائی کے

دھیہ ہو۔ ”



یہ تھوک کسی تیزاب کی طرح مجھے اپنی روح پر محسوس ہوا تھا۔ اب تک میرے دل کا وہ حصہ گلا سڑا پڑا تھا، جہاں تک اس تھوک کے چھینٹے گئے تھے۔

یہاں میں نے دوسری بار بھی اپنا تعارف ادھورا ہی کرایا تھا۔ پچھے باشیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو آپ اپنا تو لیتے ہیں مگر جانتے ہیں کہ ان کو اپنانے سے آپ کی ذات پر کیسا گھن لگ چکا ہے اور کہن لگئے حصے کو چھپایا ہی جاتا ہے۔ میں نے بھی چھپایا تھا، اپنی زندگی کا یہ تاریک اور شرم ناک پسلو۔

یہاں تک تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ انارکلی میں واقع اپنے دوست کے تیار کی ویسی بڑے اور ملک شیک کی دکان پر مازمت شروع کر دی تھی۔ یہ کام زیادہ سخت بھی نہیں تھا۔ صرف تین چار گھنٹے کی بات تھی اور تاؤ جی میرے پڑھے لکھے ہونے کے خیال سے یا پھر اپنے بھتیجے کے دوست ہونے کے لحاظ میں برتن دھلوانے، جہاڑ پونچھ کروانے کا کام بھی نہیں لیتے تھے۔

ستازمانہ تھا اور لکشمی کے رام تعلیم فنشن میں انھوں نے پرہاصل کے اخراجات میں بھی کٹوتی ہو گئی تھی۔ اس لیے گزارا آسانی سے ہونے لگا۔ اتنی رسم پختے ہی کہ میں بھی دوستوں کے ساتھ تفریق، سیر پلانا وغیرہ کرنے لگا۔ اور مسلسلہ تب ہی شروع ہوا۔ گزارا مشتعل سے ہوتا تھا تو ان عیاشیوں کے لیے نہ وقت ملتا تھا نہ روپیہ۔ اب ان عیاشیوں کی راہ کھلی تو بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ خواہشات پنهانیں کہ ایک کے بعد ایک منہ پھاڑے نظر آنے لگیں۔ اپنے پینڈوپن سے نجات مانے کی مجھے اتنی جلدی تھی کہ میں نندے سے پینوراما تک چھلانگ مارنا چاہتا تھا اور یہ اسی صورت مملکن تھا کہ کہیں سے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ جاتا۔ شاید یہی خواہشات مجھے جیسے لڑکوں کو جرام کی راہ پر بھی لے جاتی ہیں۔ منہ کیڑے، برانڈڈ جینز، مشہور لکلوں اونچے ہو ٹلوں میں کھانا۔ بائیک کی ٹنکی فل کرا کے شربھر میں پھرنا، گرل فرینڈز کو تھنے تھانے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں ذرا کم ہست تھا اس لیے چوری چکاری اور چھوٹی میوٹی ڈیکھتی کی طرف رجحان نہ ہو سکا۔ بلکہ ایمان داری سے تجزیہ کیا جائے تو میں طبعی لحاظ سے اتنا بھی گراوت کاشکار نہ

تھا کہ اپنی سلطھی خواہشات کی سمجھیں کے لیے ہر طرف ہاتھ مارنے اور کچھ بھی الثا سیدھا کر لینے کی سوچتا۔ مجھے اس جانب لانے والا ضیاء عرف زی زی تھا۔ وہ اکثر ہمارے کانج میں پایا جاتا تھا۔ جب میں فائل ایئر میں نہیں تھا، تب نا تھا کہ وہ فائل ایئر کے کچھ لڑکوں کا دوست ہے اور انہی سے ملنے آتا ہے۔ میں فائل ایئر میں آیا تو کہا گیا کہ وہ اس کانج کا اولڈ اسٹوڈنٹ ہے تا نہیں کہ اور تیسے ہماری علیک سلیک بڑھ کے بے تکلفی میں بدلتی۔ وہ آپنے انھنے بیٹھنے، پہنے اوڑھنے اور خاص طور پر خرچ کرنے کے لحاظ سے کسی اونچی اور مال دار فیملی کا لگاتا تھا۔ مگر جب مجھے پا چلا کر اس کا گھر گوالمنڈی میں ہے اور اس کا باپ اور دو بھائی اب تک اپنی پرانی رو رہ دی کی دکان چلانے اور نانیائی کا کام کرتے ہیں تو پچھہ دری کے لیے تو میں یقین، ہی نہ کر پایا۔ میں نے بڑی حرمت سے اس کے شاہانہ ثھاث بات اور شاہ خرچی کے بارے میں دریافت کیا۔

”ایک آنٹی پھنسائی ہوئی ہے۔“ اس نے رازداری سے بتایا۔

”آنٹی.....؟ ضرور اس کی بٹی سے شادی کرنے کے لارے (جھوٹے وعدے) دے رکھے ہوں گے۔“ میں نے قیاس کیا۔ دیسے بھی زی زی کی پرنسالی ایسی تھی کہ کوئی بھی آنٹی اسے اپناراہما بنانے کے خواب دیکھنے لگتی۔ اونچا لمبا گورا چننا ضیافت، کشمیری نسل کا خوبصورت گھرو تھا۔ ”ہاہاہا..... بٹی..... او...“ وہ یوں حلق پھاڑ کے ہنسنے لگا جیسے میں نے چھینٹا سالطینہ سنایا ہو۔

”مرتی ہے سالے وہ تیرے یار پر۔“

”اور تم...؟“ میں ایک دم ہونق نظر آنے لگا۔

”میں تو اپنے مطلب پر مرتا ہوں۔ صاف اور کچی بات ہے۔ ہفتے میں ایک آرہ بار اس سے ملتا ہوں۔ ابھے ہو ٹول میں کھانا کھا دیتی ہے، شاپنگ کر دیتی ہے۔ یہ چیزوں کیسے کے، سونے کی ہے، اسی نے بر تھوڑے پچھٹ کی تھی اور یہ گھری.... یہ وہ سوئنزر لینڈ سے لائی تھی۔ دو مہینے پہلے ہی اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھی۔“

کچھ دن بعد وہ مجھے کلب کے ایک فنکشن میں لے گیا۔

”رومانہ نے مجھے چار انوی ٹیشن کا رڈز دیے ہیں۔ میں صرف تمہیں اور مولیٰ کو لے کر جا رہا ہوں۔ ذرا مشتعل رہے گا۔ تم بھی ہائی سوسائٹی کو قریب سے دیکھ لینا اور ڈر تو

شاندار ہو گا۔"

اس کے درغلانے پر، میں کلب کے ڈنر پر چلا گیا اور سچی بات ہے، سخت بد مزہ ہوا۔ میرے اور موئی کی توقع کے بر عکس ایک بھی تردید نہ تھا۔ سب ہی مل اتھے عورتیں تھیں۔

"یار! لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے کیا لا ہور شر میں۔" میں نے زی زی کے کان میں سرگوشی کی۔

"لڑکیوں کو اور کیا کم مصروفیات ہیں جو وہ ان بے کار کے ہنگاموں میں دل لگانے کی کوشش کریں۔ یہ دراصل بھتیجے چراغ کی نمائی اور کیونکہ ماریار کے زندہ رکھنے کے بمانے ہیں۔" اس کی بات پر میں نے کسی نوبتوں پاپ گروپ کی شوخ دھن پر مین اس بجز کی طرح حال سے بے حال ہوتی ان ذہلتی عمر کی عورتوں کو دیکھا اور متفق ہو کے سربالانے لگا۔

"ہیلو زی زی...! تم تو لگتا ہے رومانہ کے ہی ہو کے رہ گئے۔" ایک سانوں سلونی، ریلی پٹلی... بالکل سینک سلامی سی خاتون نے قریب آتے ہوئے بے تکلفی سے نیاء کے شانے پر دھپ لگائی۔ وہ شکل سے ہی انتہائی تیز طراری لگ رہی تھی۔ لمبی، بالکل طولے جیسی آگے سے مڑی ہوئی ناک، چھوٹی چھوٹی مگر چمکدار آنکھیں، پچیلا ہوا رہا۔ مگر باریک سے ہونٹ۔ اگر وہ تیز رنگ کی چمکدار لپ اسٹک نے لگائے ہوئے ہوتی تو شاید پتہ بھی نہ چلنا کہ اس کے ہونٹ میں بھی یا نہیں۔ کھلے گریبان والے لباس میں سے اس کی خطرناک حد تک نمایاں کالریوں اور شانوں کی نوکدار ہڈیاں اس کی رہی۔ سی جاڑیت کو بھی ختم کر رہی تھیں۔

"ہم بھی دوستوں کے دوست ہیں، اتنی بے اختیالی بھی اچھی نہیں۔" بظاہر وہ زی زی سے گاؤٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات کر رہی تھی مگر اس کی عیار آنکھیں بھٹکتی ہوئی تھیں اور مکار نسم کی مسکراہٹ بھی میرے لئے ہی تھی۔ زی زی نے اس کی دلچسپی بھانپ کر اعماق کرایا۔

"یہ میرا دوست ہارون ہے اور یہ سویں ہیں،" رنگ برنگ "بوتیک کی اوڑز۔"

یہ ایک بہت بڑا توصلہ تھا، میں زرا مرعوب ہو گیا۔ یہ میری سرزنشی سے پہلی ملاقات تھی جس میں انہوں نے مجھے اپنا کارڈ دے کر اپنی بوتیک آنے کا رزرو و عده لیا۔ مجھے آپے سے باہر کرنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ شرکی اتنی مشہور شخصیت نے مجھے اس تدر اپنائیت سے دعوت

دی ہے۔ ساری محفل کو چھوڑ کے مجھے دوستی کے قابل سمجھا ہے۔ اس وقت تک وہ میرے لیے محض ایک بڑا نام تھی، ایک مشہور نام..... اسے عورت کی نظر سے تو میں نے دیکھا ہی نہ تھا، نہ ہی اس میں عورتوں والی کوئی بات تھی۔

زی زی نے اصرار کیا کہ مجھے بوتیک کا ایک چکر ضرور لگانا چاہیے۔

"یار! میں کروں گا کیا وہاں.... اچھی خاصی مسٹکی بوتیک ہے۔ ہمارے جیسے تو باہر سے دیکھ کے ہی خوش ہو سکتے ہیں۔"

"اس نے خود تمہیں بلا یا ہے۔ ایسے ہی تعلقات کی راہ کھلتی ہے۔ آج کے دور میں اونچے لوگوں سے ہی تعلقات کام آتے ہیں اور مجھے تو لگتا ہے وہ سرزنشی جو نام ہی کی سویں ہے تھی پری طرح لٹھو ہو گئی ہے۔ اس دن تم بڑے پوچھ رہے تھے کس سے۔"

"خدا کا خوف کرو... کہاں وہ کہاں میں۔" میں سُم گیا مگر آٹھویں دن زی زی کے پر زور اصرار پر ملنے چلا ہی گیا۔ وہ خاصی گرم جوشی سے ملی۔ زی زی کے اندازے سو فیصد درست ثابت ہوئے۔ میں جز بزرگ ہوا۔ اس کا نام "شرت" روپیہ بیسہ سب کچھ اپنی جگہ درست، مگر وہ الگ معاملہ تھا میرے ذوق حسن کی تسلیم تو اس سے نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب اس نے مجھے اپنے بوتیک کا شاندار مسٹکی کا شن کا ذیراں کر تاشلوار، دوٹی شرٹس اور ایک ڈینیم گفت کی تو کچھ نہ کچھ تسلیم کا سامان ہو گیا۔ اب اس کی طوطا جادو گر جیسی ناک اتنی بھی بڑی نہ لگ رہی تھی۔ اور نہ ہی دوسری بار اس سے ملنے کے لیے جاتے وقت مجھے زی زی سے مشورہ کرنے کی ضرورت تھی۔

اس نے میرے ہائل فون کر کے مجھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔ یہ تقریباً "آخری دن تھے" میرے ہائل میں اس کے کچھ دنوں بعد میں لکشمی چلا گیا، دہلی جانے کے کچھ عرصے بعد سیکنڈ جاوید سے ملکرایا۔ اور اس سے محبت ہونے میں مجھے دوپل بھی نہ لگتے تھے، البتہ تب تک میں خواہشوں کے جنگل میں راستہ بھٹک چکا تھا۔ میرے منہ کو خون لگ کا تھا۔ میں نے اپنی خواہشوں کے لب کاٹوں پر جو رکھ دیے تھے۔

سو نیا سے میری محبت میں دم تھا، جان تھی مگر میری خواہشوں یا یوں کہیے میری حرث زیادہ زور آور تھی۔ میری

بڑھتی ہوئی طلب نے مجھے پچھاڑ دالا تھا۔ بے معنی خواہشوں کے ہاتھوں میں چاروں شانے چیت ہو چکا تھا۔ تب اتنے بڑے میں تمیز کرنے کے بجائے باغی اور حریص دل صرف ایک بات سمجھاتا۔

"جس طرح بھی ملے، جیسے بھی ملے، بس سمیٹ لو۔ اس لیے اے کی ذکری کے ساتھ اگر ہستے میں تین چار ہزار روپے کمائے کو مل جاتے ہیں تو یہ دیکھنے کا کیا فائدہ کہ کہاں سے ملتے ہیں اور کس چیز کے ملتے ہیں۔ یہ دنیا خریدار ہے، جب فن بیچنا گناہ نہیں، ہنر اور زیارت کے بل بوتے ہے کہاں جائز ہے تو پھر اپنی وجاہت اور ظاہری کشش سے فائدہ اٹھایاں گلط کیسے ہو سکتا ہے۔"

اور جب سوئی نے میرے کہنے پر سونیا کو اپنے بوتیک میں جا ب ری تب میرا یہ لفظ اور پختہ ہو گیا کہ بڑے شہروں میں رہنے بننے کے لیے اتنے تعلقات بہت ضروری ہیں۔ اگر میرا لند کاٹھ اچھا، نقش پر کشش اور اڑھنے ستنے کا ڈھنگ متاثر کن نہ ہوتا تو بھلا سوئی مجھے منہ کیوں لگاتی۔ شاید وہ مجھے اپنا ملازم رکھنا بھی پسند نہ کرتی لیکن اب میں اس کا دوست تھا۔ بلکہ دوست سے کچھ زیادہ ہی وہ مجھے فیشن شو میں اپنے ساتھ رکھتی، اپنے سرکل کی ہریارٹی میں میرے ساتھ جانا پسند کرتی۔ بھلا میرا کیا جاتا تھا اگر وہ چار اوگوں میں شومار لیتی تھی کہ اس عمر اور اس شکل و صورت کے ساتھ بھی وہ ایک بندسم بوانے فریڈر رکھنا "افورڈ" کر سکتی ہے۔ اس کی عزت بیخی رہتی اور میرا کام نکالتا رہتا۔ ایسے ہی ایک فنکشن میں میری ملاقات شیلا سے ہوئی۔ وہ سوئی سے بھی سکڑی چیز تھی۔ سوئی کی طرح گھما پھرا کے بات گرتے آفٹ کالاچ چ دے کریا دوستی کا لیبل لگا کر اپنے تعلقات برسانے کے بجائے اس نے سیدھی اور صاف بات کی۔

"کیا ریتی ہے تمیں سرز توریا اپنی ہی بوتیک کے آؤٹ آف سین کلیکشن میں سے نکالے چند سوت، ایک آرہڈنر، اور بس..... آج سے تم میرے لیے کام کرو گے۔"

اس کی نوازشات بھی سوئی سے بڑھ کے تھیں۔ میں یہ سب اپنا حق کبھی کے وصولتا تھا۔ مجھے بظاہر اس میں کوئی براہی نظر نہیں آتی تھی۔

سوئی جیسی بے کشش عورت، جس کا شوہر خود ایک کردڑپتی بزرگ میں تھا اور جو فیملی پریشر میں آگر اپنی اس کم

صورت فرست کرن سے شادی تو کر بیٹھا تھا مگر جس کے لیے وہ شادی کے تیرہ سالوں میں ایک بار بھی اپنے دل میں نرم گوشہ نہ پیدا کر سکا، اسے بھلا حسین چہروں کی لئی تھی.... وہ اپنی دنیا میں ممکن تھا اور بے اولاد سرز توری سوئی کے نام سے ملک کی ایک نامور فیشن ڈائرینٹر کے طور پر اپنی پیچان بنانے لگی۔ اور پر والے نے اسے ایسا سریا تو نہ دیا تھا کہ اسے چاہا جاتا مگر اس کے دل میں چاہے جانے کی طلب تو تھی۔ اور عمر اور دولت کے اضافے کے ساتھ ساتھ یہ طلب بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ پسے پھینک کے اپنے چاہنے والے پیدا کرنے لگی۔ میں پارٹیز میں اس کے گرد منڈلا تاً، سب کے سامنے اس کے لیے وار قٹکی اور دیوانگی کا منظاہرہ کرتا۔ اس کے ایک اشارے پر مرنے کو تیار... خود کو دھوکا دینے کے لیے یہ بھی بست تھا۔

اور روزی جس کے نام میں شادی اور تازگی ضرور تھی مگر اس کے اپنے اندر یہ چیزیں ناممکن بھی موجود نہ تھیں۔ ایک لوڑ کلاس گرسچنریٹی سے تعلق رکھنے والی روزی، جو لڑکین میں لوگوں کے گھروں میں جھاڑو یو پنچھا تک کرتی رہی۔ اس کی کہانی سنو تو کسی افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ کیسے ایک پارلر میں صفائی کرنے کے کام سے آغاز کیا، دیکٹنگ ترنسکرپشن والی درکار سے ترقی کرتے کرتے دلہن تیار کرنے والی بیوٹیشن کے رتبے تک پہنچی۔ مگر جدو جمد کے ان چالیس سالوں نے اس کے عورت پن کو کہیں دفنایا تھا۔ وہ اپنی بالی سوسائٹی کی فرینڈز کے سامنے اپنی ناک کھوایا تھا کہ اپنی دولت کے باوجود وہ ایک عدعاشق تک پیدا نہیں کر سکتی۔

اور شیلا، سب ہے رچپ کردار، وہ لاہور میں شکاری آئی کے نام سے بچانی جاتی تھی۔ اس کا مسئلہ محرومی نہیں ہوں تھا۔ مجھے سے نہلے زی زی اس کے چنگل میں پھنس دیکھا تھا اور آزاد ہونے تک خاصا مال بنا چکا تھا۔ اس کی نیت جتنی جلدی کیا پہ خراب ہوتی تھی، اُتنی ہی جلدی اس کا دل بھی بھر جاتا تھا۔ لیکن مجھے پر اس کی خاص نظر کرم رہی۔ میری زیانت، میری چرب زیانی اور خوش گفتاری کو وہ ایک شرا کو والیٹر میں شمار کرتی تھی جو اس سے قبل اس کے کسی پالتو عاشق میں موجود نہیں تھیں۔

سوئی کی حد تک تو ٹھک تھا، وہ بے ضرری چیز تھی مگر شیلا اور روزی تک پہنچتے پہنچتے میرے دل میں کھٹک پیدا ہو گئی۔

جو اس سال انیکشن ہار گئی ہے، اُنی کا ایک مشور اداکار اس کی مٹھی میں ہے۔ ناہے اس کے لیے فلم پروڈیوسر کر رہی ہے، پتا نہیں کہ بھی رہی ہے یا ہیرو بنانے کا جھانس دے کر الوبنایا ہوا ہے۔ اور وہ لال بالوں والی۔ اس کا فشیر ایک کرکٹر کے ساتھ مشور رہ چکا ہے۔ اسے قوی کر کٹ ٹیم میں شامل ہی اس کی سفارش پر کیا گیا اور آج کل کوئی صنعت کار پھنسایا ہوا ہے۔ اور وہ دیکھو روزی کو ہر نئے ماڈل کو مشور ہونے نے پسلے اس کے ساتھ اپنا معاشرہ مشور کرنا پڑتا ہے۔ اخباروں میں رسالوں میں اس کے قصے نئے نئے لڑکوں کے ساتھ پھیتے رہیں تو بڑی خوش رہتی ہے۔

”یہ..... یہ تو طوالِ الفوں سے بھی گئی گزری ہیں۔“ سونیا جوان کے کوتولت سن کے حیرت زدہ تھی۔ بمشکل تھا کہ سکی۔ لفظ طوائف بست دقت کے ساتھ اس کی زبان سے ادا ہوا تھا۔

”ارے طوالِ الفیں تو بے چاریاں پیٹھیا لئے کے لیے یہ سب کرتی ہوں گی۔ اور میں تو کہتی ہوں اصل بے غیرت تو وہ لڑکے ہیں۔ یہ شیلا میڈم آئے دن ایک دم چھلانگ کے رکھتی ہے خریدا ہوا۔ آج بھی آنے والا ہے۔ اب دیکھنا شو خیاں دکھائے گی سب کے سامنے۔ لو دہ آگیا۔“

اور سونیا کی نظر مجھ پر بڑی۔ تب تک میں نے اسے نہیں دیکھا تھا اس کے شیلا کو خوش کرنے کے لیے اس کا بھدا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے بڑی شارہ بوجانے والی نظر وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کوئی رومانٹک جملہ جھاڑ رہا تھا۔

”لعنت ہے تیرے مرد ہونے پر۔“ سونیا کی ساتھی نے مجھے لعنت دکھائی۔

”ہاتھ پیر ہونے کے باوجود ایک عورت کے تلوے چاٹ رہا ہے، بے غیرت، مرد اگنی کے نام پر دھی۔۔۔۔۔۔“

اور تب میری نظر اس پر بڑی تھی۔ شیلا کی صحبت مند کر کے گرد پھیلا میرا بازو بے جان ہو کے میرے پہلو میں آن گرا تھا اور وہ تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔

تب بھی میرے دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ میں کوئی نہ کوئی بمانہ گھر کے اسے مطمئن کر لوں گا اور اصل تب تک میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے مجھے صرف شیلا کے ساتھ بے تکلفی سے کھڑا ہی نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ کسی کی زبانی میرے اور اس کے تعلق کے بارے میں بھی جان

ایسا لگتا تھا جیسے ان دنوں میری زندگی دو الگ الگ ریکرے روں روں تھی۔ ایک ریکرے وہ تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اور دوسرا وہ جس پر میں سونیا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ محبت کو اظہار کی زبان میں تو وہی ہونے لگا جو ایسے معاملات میں ہوا کرتا ہے۔ جلد ہی ہمارے درمیان شادی کا سوال بھی جاگ آئا۔

”سنو، مجھ سے شادی کرو گی؟“ ایک دن نجاتے کس شدید تمنا کے زیر اثر میں بلا سوچ مجھے اس سے کہہ بیٹھا۔

”اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔“ وہ پہلی بار کھلکھلا کے نہیں پڑی تھی اور اس کی اس پہلی پہلی نہیں نے ”بے ساختہ خوشی نے مجھے سمجھ دی ہے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ میں اس کی اس خوشی کو امر کرنے کے بارے میں کوئی قدم اٹھاؤں۔ میرا گزارا ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ ضرورت سے زیادہ ہی والٹ نوٹوں سے، دارڈ روپ کپڑوں سے اور باسیک پیٹروں سے بھری رہتی مگر گھر چلانے کے لیے کسی مستقل روزگار کا ہونا ضروری تھا۔ دوسری طرف ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ بھلے میرا اپنے اندر کے دبے دبے احتجاج کو کھلنے کی خاطر یہ تاویلیں کھڑلیا کرتا تھا کہ میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہا مگر یہ احساس بھی تھا کہ سونیا کے علم میں یہ سب آیا تو وہ مجھ سے تنفس ہو سکتی ہے۔ میں نے سمجھ دی ہے یہ سب کچھ ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

شیلانے پتا نہیں کس کی سفارش دلوانے کا لائق دے کر مجھے جم خانہ میں بلوایا۔ میں بھی اسلام آباد کی فرم میں پرکشش جاپ کا سن کرفورا ”چل پڑا۔ اتفاق کی بات ہی کہ اسی جگہ انہوں نے تبلولا کھلنے کے ساتھ ساتھ اس بھی اسی مفتی دہاں سے تین اسٹاف ممبرز کو بھی انھالا لی جن میں سے ایک سونیا بھی تھی۔ یہی میری کم بختی کی وجہ تھی۔

”تس قدر بھونڈی لگ رہی ہیں یہ مائیاں، کھی کھی کھی کرتے ہوئے۔“ ایک لڑکی نے ان کی خرستیوں پر ناک بھوں پڑھاتے ہوئے کہا۔

”پیسہ ہو تو عمر کون دیکھتا ہے۔ ہماری تمہاری ماں کی طرح بھی پیدا ہوتے ہی بودھی نہیں ہو جاتیں یہ بیگمات۔“

تیسرا جو کافی عرصے سے اس اپنے بھی اور تقریباً اندر کی ساری باتیں جاتی تھیں، ملخی سے کہنے لگی۔

”ان میں سے کچھ نانیاں داریاں ہیں۔ وہ والی جو ہے نا،“

صرف میرے پاک ہونے سے کیا ہوتا ہے اگر میرے آس پاس کچھ ہو تو...؟ یہی سوچ کر میں نے ماں کے پاس رہنا گوارا نہیں کیا تھا۔ میں تم سے بھی دور ہونا چاہتی ہوں کیونکہ تمہارے گندے اعمال کا سایہ مجھ پر ڈے یہ مجھے قبول نہیں۔"

"سو نیا!" مجھے ایسا لگا تھا جسے کسی نے میری روح کھینچ لی ہو۔ اس کا پھر پلا چڑھے میری آنکھوں کے آگے دھنڈ لاسا کیا تھا۔

"ایسا مست کرو۔ میں مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اعتراف کرتا ہوں۔ تم کوئی اور سزا یہ لو مگر یہ نہ کر دیں۔ جدائی مت لکھو،" میں وعدہ نہیں قسم کھاتا ہوں کہ اب دوبارہ...."

"پلیز ہارون! یہ اعتراف کسی اور کے سامنے کرنا یہ قسم بھی کسی اور کے لیے کھانا۔ مجھے معاف رکھو۔" اس نے ہاتھ جوڑے۔ "میری طلب محبت نہیں، عزت ہے۔ اور یہ تو طے ہے کہ تم اب میری طلب پوری کرنے کے قابل نہیں رہے۔ میں کم پر ترس کھا کر تو شادی نہیں کر سکتی اور کر بھی لوں تو جتنا تمہارے ساتھ رہوں گی، میری تم سے نفرت بڑھتی جائے گی۔ کیا کرو گے اتنی نفرت سمیٹ کر مجھے تو یہ سوچ کر ہی گھن آتی ہے کہ کبھی میں نے تم جیسے مرد سے... چھی... اس نے زمانے بھر کی نفرت اور حفارت تھوک میں لپیٹ کر چھینکی اور میرا دل تیزاب کے چھینٹوں سے جل اٹھا۔

اس رستے سے پلٹنا اتنا مشکل نہ تھا۔ میرے پیر کسی بھوری نے نہیں، صرف بے جاخواہشات نے باندھ رکھے تھے۔ جب دل ہی مردہ ہو چکا ہو تو خواہشات میں حان کب تک رہتی۔ میں لاہور چھوڑنا چاہتا تھا، شیلانے گزرے ہوئے وقت کی اچھی یادگار کے طور پر اپنی کسی دوست کے یاں اسلام آباد میری سفارش بھجوادی اور مجھے رحمان شخچ کے ہاں ملازمت مل گئی۔



میں نے پلٹ کے پیچھے دیکھنا چاہا، میرے ابا میرے وعدے کے پورا ہونے کی آس لیے گزر رکھے تھے۔ پچھلا سب کچھ مٹ چکا تھا۔ اب میں اگلی کہانی لکھنے جا رہا تھا۔ محنت، لگن اور دیانت داری نے مجھے جلد ہی رحمان شیخ کی نظر والیں میں قابل اعتبار بناریا۔ میری ترقی ہوئی اور پھر رئی

چکی ہے۔ یہ تو بعد میں مجھے اسی سے پتہ چلا تھا اور میری وہ حالت تھی کہ میں اس کی معلومات کو بھٹلا بھی نہ سکا تھا۔ اس نے مجھے کیا کچھ نہ کہا تھا، میں سنتا رہا مگر تب مجھ سے برداشت نہ ہوا جب اس نے میری محبت پر شک کیا۔ وہ کہ رہی تھی۔

"اب بھی کہ مجھ پر تمہاری نوازشات کا کیا مطلب تھا۔ مجھے اکیلا بے سار اجنب کے مجھ سے ہمدردی ہوئی تھی نہ ہی محبت بلکہ میری مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا تم نے۔ مجھے زیر بار کر کے نزد پر کرنا چاہا۔ تم مجھے شیلا جیسی عورت کے ہاتھ پہننا چاہتے تھے۔ تم سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" میں اس بے نیاد الزام پر تریکھا تھا۔ "میں محبت کرتا ہوں تم سے۔ یہی چیز ہے اور باقی سب بکواس۔"

"میں ہارون صندر را تم ایک چیز اور مکرہ انسان ہو۔ یہی چیز ہے اور باقی سب بکواس۔ جو انسان خود کو چیز سکتا ہے موقع ملنے پر کسی اور کی بولی کیوں لگائے گا۔ جسے عزت و حیثیت کا مطلب ہی معلوم نہ ہو، وہ اس کا لحاظ کس لیے کرے گا؟"

"بھول جاؤ سب کچھ..... میں بھی بھول جاؤں گا۔ میں شادی کے بعد تمہیں... میں گڑ گڑایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔

"شادی... کیسی شادی؟ تم سے شادی؟" وہ نزد اٹھی۔ "تمہاری اصلاحیت جانے کے بعد کون لڑکی تم سے شادی کرنا پسند کرے گی، کم از کم میں تو ہرگز نہیں۔ میں... جو عزت کی روشنی کھانے کے لیے سارے عیش و آرام چھوڑ کے لیے اور کینسر کے مارے، بستر پر ریسے باپ کے سیلین زدہ گھر میں آگئی تھی، اپنا آپ مفاسی چفا کشی اور بھوک کی بھٹی میں جھونکنے، ان گزرے پانچ سالوں کی محنت نے مجھے کندن بناریا ہے ہارون! تم جیسا پتھر سے بھی ارزان شخص میرے لاریکیے ہو سکتا ہے؟ تمہارے بجائے میں کسی ایسے مزدور کو اپنے قابل سمجھے لوں گی جس کے ہاتھوں پر مٹی اور انہیں دعوہ دھو کر چھالے ری چکے ہوں گے، میری ماں نے مجھے بھی بھی زبردستی اپنے کام میں شامل نہ کرنا چاہا تھا۔ میں چاہتی تو آرام سے اس کے گھر میں رہتی، کھاتی پیتی، یہ ہتھی ہر فکر سے آزار... لیکن مجھے صرف رو و قت کی روی تھیں چاہیے تھی، مجھے عزت بھی چاہیے تھی۔

سونیا کی طلب پھر سے جانے کے باوجود میں نہیں کے بارے میں بھی فکر مند تھا۔ میں اپنا گھر ٹوٹنے سے بچانا چاہتا تھا۔

”ہائے باروں صندرا زمانہ بدل گیا“ تمہارے دل کی حرکت اور طبع نہ گئی۔ یہ بھی میرا ہو وہ بھی اپنا ہو..... سب کچھ چاہیے، تمہیں سب کچھ۔“ میں نے دل گوتاڑا۔

”ایک بار، صرف ایک بار اور ضرور ملوں گاتم سے سونیا! یہ پوچھنے کے لیے کہ میرا ساتھ تمہیں گوارانہ تھا۔ بڑے پارسائی کے دعوے کرتی تھیں تم پھر کہاں گئے وہ دعوے نہ تھاں رہ گیا وہ تمہارا آئینڈیل مزدور جس کے چھالے والے ساتھ پیر تمہیں مقدس لکھنے تھے۔ اب فرقان بٹ کی سیکری بن کر تمہیں کیا لگ رہا ہے، یہ تو بتانا پڑے گا۔“

جب جب یہ خیال آتا تھا، میرے دل کو جیسے کوئی آری سے کائے گلتا تھا۔ میں جیسا بھی تھا، جو بھی کرتا رہا تھا۔ اسے تو سیدھے سارے طریقے سے اپنے گھر کی عزت ہی بنانا چاہتا تھا۔ وہ اسے قبول نہ تھا۔ اب اس حیثیت میں.... نہیں سونیا... سکینہ جاوید، نہیں میں تمہارا یہ قصور معاف نہیں کروں گا۔

میں نے ایک بار اور آخری بار اس سے ملنے کا فیصلہ کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ اور کرنا تھا۔

\* \* \*

”نشی اکیا بھی تمہاری وہ خواہش برقرار ہے؟“  
اگلے روز میں اس کی انگلی میں بیش قیمت ڈائمنڈ رنگ پہناتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”وہی خواہش، جس کا اظہار تم نے ہماری تیسری ویڈنگ اپنی درسری پہ کیا تھا کہ تم آسٹریلیا مود کرنا چاہتی ہو جہاں تم نے اپنی ایک زندگی گزاری ہے۔“

”یاں، مگر تمہاری ناپسندیدگی دیکھ کے میں نے یہ خواہش دبایی ہی۔“

”دبا لی تھی۔ یعنی دست بردار تو نہیں ہوئی تھیں تم اس سے۔“ میں مسکرا دیا۔ ”میں نے تمہاری خواہش پر ناپسندیدگی ظاہر نہیں کی تھی صرف مجھے خود کو آمادہ کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب تم اپنی اس خواہش پر عمل کر سکتی ہو۔“

”واقعی؟“ وہ حیرت و مسترد کے ملے جلے اظہار کے ٹھوڑ پر چلا اٹھی بعد ”تم اپنے لیے کسی بھی دن کی لگت

پسے ملاقات۔ رحمان شیخ کی اکاؤنٹ بینی، جو آسٹریلیا سے آئی تھی۔

اس اداں رہنے والی بکھری بکھری سی اڑکی کو جب پہلی بار دیکھا تو محبت نہیں صرف ہمدردی دل میں جائی تھی۔ محبت اور توجہ کی متلاشی وہ لڑکی ناقدری کاشکار تھی۔ اور جب رحمان شیخ نے مجھے اپنی اس اکاؤنٹ، حسین اور اعلاء تعلیم یافتہ بیٹی سے شادی کرنے کا مشورہ دیا تو میری حیرت کی انہانہ رہی۔ بھلا میں ہی کیوں؟ مجھے میں ایسا کیا ہے جو یہ...؟

ان ہی دنوں میں نے سونیا کی تصویر اخباروں میں دیکھی، وہ کسی ٹوٹھ پیٹ کے اشتہار میں مسکرا رہی تھی، پھر وی وی کے ایک لیے میں معمول سے بھرتی کے گردار میں دیکھا۔ وہ اب سونہنی تھی۔ سونہنی، ایک نی اور ابھرتی ہوئی ماڈل کم ایکٹریس، اس نے مجھے کس تدر لعن طعن کی تھیں، گالیاں تک دی تھیں، تھوکا تھا مجھ پر۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اسے حق بجانب سمجھا، اس کے اس روایتے کے خلاف گلہ نہ پیدا ہوا میرے دل میں۔

”کیوں سونیا کیوں؟ انگرت تھی نا تمہیں ان سب سے پھر کیوں؟ جب اس معااملے میں تمہاری نفرت بھجوہتہ کر سکتی تھی تو میرے معااملے میں کیوں نہیں؟ تم نے ہی تو کہا تھا کہ شوبز میں آئے سے میری نیک نامی میں فرق آسکتا ہے جو میں نے اپنے مل بوتے پر بہت محنت سے کمائی ہے، تجھب آج تم اپنے سوول پس پشت ڈال سکتی ہو تو میرے لیے اتنی تخت ہیوں، وہ تھیں؟“

اور پچھلے سو جھاتوں میں نے رحمان شیخ کو ہاں کر دی۔ یہ میرے نزدیک احتیان کا انوکھا طریقہ تھا۔ میں پسے بنانے میں جست گیا اور نئی گھر بنانے میں۔ حقیقی معنوں میں ہم جیسی کی پیدائش کے بعد قرب آئے۔ بلکہ اس نے مجھے اپنے دل میں تب جکہ دی۔ شاید اس کے دل میں کچھ شکوہ و شہمات رہے ہوں، لیکن اتنی مصروفیت کے باوجود جیسی کے لیے میرا پیار اور توجہ دیکھ کے دہ مطمئن ہو گئی۔ اب وہ تن، من، دھن سے میری تھی۔ اور میں پہاڑ نہیں... پہاڑ نہیں میں اس سے محبت کرتا تھا یا نہیں البتہ قدر ضرور تکر رتا تھا۔

اور آج ساڑھے چار سال بعد میں دو جانب سے وسوسوں اور پریشانیوں کا شکار تھا۔ ایک جانب شیلا کے نشی کے ساتھ بڑھتے تعلقات، تو دوسری جانب میرے دل کی سونیا کے بارے میں مزاحمت۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ

# ہٹاپ سے نجات

کہا جاتا ہے کہ ہر بیماری کی جڑ پیٹ کی خرابی ہے، موڈا پا اور پیٹ کا بڑھانا خواتین کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسی طرح چہرے پر مہا سے کیل، جھائیں بھی پیٹ کی خرابی سے ہوتی ہیں۔

خواتین کے ان تمام مسائل کا حل

فایاب چڑی بوٹیوں سے تیار کردہ



کنفرم کراسکتی ہو۔ اللہ مجھے بزنس و اسٹڈاپ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اُنھی اینی درسری یعنی ہماری شادی کی پانچویں سالگرہ ہم منائیں گے۔ مگر یہاں نہیں آشنا لیا میں۔"

"اوہ ہارون! آئم سوپی۔ آئم سوکن۔" وہ میرے لگے لگ گئی۔ محبت اور تشکر دونوں کے اظہار میں وہ والمانہ شدت رکھتی تھی۔

اب میری اگلی منزل سوئا تھی۔

"تم میں مجھ سے نفرت ہے، تکریں نے تم سے کبھی محبت کی نہیں اور اس محبت کے دوائل سے تم اب بھی میرے لیے قابلِ احترام ہو۔" میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ "میں اس کے روپوں تھا۔

"کس حال میں؟" اس نے تیوری ڈال کے پوچھا۔

"تم بستر جانتی ہو۔" میں نے شانے اپکائے۔ "مجھے تو تم نے ایک موچ تک نہ دیا۔ تو پھر اپ کون سی عفت والی زندگی تی رہی ہو تم... کیا اب تمہیں ذلت اور شرم محسوس نہیں ہوتی؟"

"ذلت اور شرم... یہ احساس مجھے زندگی میں ایک بار محسوس ہوا ہے، ہارون صدر اور اس شدت سے بوا ہے کہ اب بھی میں دوبارہ اسے محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتی۔"

آج وہ محبت نارمل لبے میں بات کر رہی تھی۔

"اب یہ ایک نیا اراام تو مت دو مجھے کہ تمہاری بے حس بھی میری وجہ سے ہے۔ تم نے ماؤنگ بھی میری چڑی میں شروع کی اور اب فرقان بٹ کے ساتھ تمہارے تعاقبات بھی...."

"شک اپ ہارون! اس بات کو تم جانتے نہیں، اس کے بارے میں فضول اندازے لگانے کی ضرورت نہیں۔" وہ درشت انداز میں کہہا۔

"ماؤنگ کرنا میری تھا قلتی لیکن اس وقت میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ سزا مفتی سے میرے اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ مجھے مجبوراً" ریزاں کرنا پڑا۔ میرے ہائل کے ڈیویز میرے اپنے ذاتی اخراجات، ان سیپ کے لیے مجھے فوری طور پر ایک مازمت چاہیے تھی۔ میرے ہائل میں فی الحال یہی ایک آفر تھی جو مجھے تمہاری شیلا ڈارنگ نے دی تھی۔ اس دوران میں نے معقول قسم کی جاب کی تلاش جاری رکھی۔

• قیمت صرف 60/- روپے

**ہنلو آفے کاپٹہ**

- خواجہ اسٹور کیمپ اینڈ ڈرگسٹ مرچنٹ - بالمقابل ایمس پریس مارکیٹ صدر کراچی - فون: 5212257
- شاہد میڈیکو ہومیو اینڈ یونافی سپر مارکیٹ فضل بلڈنگ آرام باع روڈ حصاری - فون: 5849828
- خان یوکل اسٹور پارٹ منڈی شاہ عالم گیٹ لاہور - 7665454
- عبدالواحد محمد شریف شالق شاپ نمبر 67 غزہ شارع عبد اللہ نیصل مکہ مکرمہ - سعودی عربی بر. فون: 02454545

برابر رتبہ دے دے۔ دیکھو کب تک چلتا ہے یہ بھب۔ وہ بے چارہ مجھ سے ہمدردی کر کے پھنس گیا ہے۔

”بے چارہ کیسا؟ تم سے ہمدردی کے نام پر اس نے اپنا او سیدھا کیا ہے۔ سیدھی طرح تو تم قابو آنے سے رہیں۔“

”جو بھی ہے، وہ میرے کام آیا، درنہ مجھے مجبور اور بے سار اجان کے اور بھی شیر ہو سکتا تھا۔ میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر مجھے بلیک میل کر سکتا تھا۔ اسے کوئی مجبوری تو نہ تھی کہ مجھے نکاح میں لے کر اپنا بابا یا گھر خطرے میں ڈالتا، اس لیے آج اگر اس کی مرضی کے مطابق مجھے اس نکاح کو خفیہ رکھنا پڑتا ہے اور ایک شادی شدہ عورت ہوتے ہوئے بھی مشکوک حیثیت اختیار کرنا پڑتا ہے تو مجھے زیادہ دکھ نہیں۔“

”لیکن ایسا کب تک چلے گا۔ اگر... اگر واقعی تمہاری.... دیکھو سونیا! میری بات کاغذ مطلب مت لینا لیکن اگر تمہاری فرقان بٹ سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں تو تم اس سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”تحفظ تو تمہیں کوئی بھی دے سکتا ہے۔ میں بھی۔“  
ڈرتے ڈرتے میں نے اپنی بات کی مگر خلاف توقع وہاں کوئی طوفان پیدا نہ ہوا۔ اس کے بر عکس اس نے بڑے اطمینان سے اپنا سریٹ کی پشت سے لگایا اور اپنی ٹھنڈی نظریں مجھے گاڑ کے اتنے ہی ٹھنڈے لمحے میں کہا۔

”وہ تم....؟ کیا تم خود کو تحفظ دے سکتے ہو؟ فیش شو میں، میں نے تمہارے چہرے کی رنگت اڑتے دیکھی تھی، جب تمہیں سویٹ کے وہاں موجود ہونے کی خبر ملی تھی۔“

اس کا طنز میں آرام پی گیا مگر اس نے بس نہ کیا۔

”میں تو خود ہر لمحہ اپنا بھرم کھونے کا ذر رہتا ہو گا۔ اپنے گھر کے بکھرنے کا خوف کسی تلوار کی طرح تمہارے سر پر لکھتا ہو گا۔“

”ایسی بات نہیں، تمہاری ناراضی کے بعد میں نے وہ سب بست عرصہ پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ تم سے محبت کا چلن ترک نہیں کر سکا میرا دل.... اس معاملے میں میں بے بس ضرور ہوں لیکن نہیں! اپنی بیوی سے میں سو فیصد مخلص اور دیانت دار رہا ہوں۔ میں اب وہ ہاروں صفر در نہیں ہوں سونیا! تمہیں میری ذات کے متعلق جتنے اعتراضات تھے وہ اب باقی نہیں رہنے چاہئیں۔ رہا نہیں کا سوال.... تو وہ

میں ناکام ہونے نہیں نکلی تھی، میرے پاس بے شمار آفرز تھیں جو میں قبول کر لیتی تو نام پیسہ، شرط سب میرے قدموں میں ذہیر ہوتا۔ مگر یہ سب چھوڑ کے میں نے ایک ہوٹل میں بینکوٹ مینجر کی جاپ کر لی۔ وہیں میری ملاقات فرقان بٹ سے ہوئی۔ پھر میں یہاں آگئی۔“

مجھے محسوس ہوا کہ درمیان میں ایسا بست کچھ تھا جو وہ گول کر گئی۔

”مگر وہ کیوں.....؟ وہ ہی کیوں....؟ آخر فرقان بٹ، ہی کیوں؟ میں کیوں نہیں؟“

”میں بانٹی ہوں وہ کوئی بست نیز قسم کا بندہ نہیں، نہ ہی وہ ایسا شخص ہے جسے میں چاہ سکتی ہوں مگر میری مجبوری تھی۔ میری ماں.... میری ماں پاروں!“ اس کے صبر کا پیانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس کی عمر مذہل گئی تھی، ایک ڈھلتی عمر کی طوالِ فی کی کل پونچی اس کی جوان بیٹی ہوتی ہے۔ وہ مجھے گھیرنے لگی تھی۔ فرقان بٹ نے ایک عرصہ میل مجھے اپنے ہاں جاپ کی آفریکی تھی جو میں نے رد کر دی تھی۔ وہ اپنے طور اطوار سے ہی ایک اوپاش شخص نظر آتا تھا جو عورت کو صرف استعمال کی چیز سمجھتا ہو۔ لیکن جب ہوٹل کی انتظامیہ نے مجھے وارنگ ری کیونکہ ماں کے بیچے غندے اب مجھے وہاں تک پریشان کرنے کے لیے آز لگے تو میں نے فوری طور پر وہ جاپ چھوڑ کے فرقان بٹ کے آفس میں جاپ کر لی۔ مقصد صرف ان غندوں سے پچھا چھڑانا تھا جو میرے ہوٹل کا پتا جانتے تھے لیکن انہوں نے اب ویسی ہائل کا رستہ دیکھ لیا۔ میں خوفزدہ ہو گئی۔ ایک بار اسی پریشانی کے عالم میں فرقان بٹ سے ذکر کر دیا۔ اس نے مجھے نکاح کی پیشکش کی۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میں نے کس مجبوری کے عالم میں یہ منظور کیا ہو گا۔“

”تو کیا فرقان تمہارا.....؟“

”ہاں، اس نے مجھے نکاح کیا ہے۔ خفیہ ہی سی مگر میری ماں کو اس کے ارادوں سے باز رکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ میں فرقان کے دیے ہوئے فلیٹ میں رہتی ہوں۔ اس کی گاڑی میں اس کے باڑی گارڈ اور ڈرائیور اور میرے بیگ میں ہر وقت ہمارا نکاح نامہ موجود رہتا ہے۔ بس ایک یہی تحفظ ہے میرے پاس۔ وہ اپنی بیوی کے اثر و رسوخ والے بھائیوں سے ڈرتا ہے جو بہنوئی کا ایک سر کریا اس کی سیکریٹری سے نواز شات تو برداشت کر سکتے ہیں مگر یہ نہیں کہ وہ کسی بھی گئی گزری عورت کو ان کی بہن کے

ہی بیچ ڈالی۔ تمہارے جیسے سر سے پیر تک کہے ہوئے انسان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم جا سکتے ہو، کبھی دوبارہ نظر نہ آنے کے لیے۔ ”اس نے مجھے باہر کارستہ دکھایا۔ میں تھکے قدموں، جھکے شانوں اور زین پر گڑی نظریوں کے ساتھ پلٹ گیا۔ واقعی کبھی بھی دوبارہ نظر نہ آنے کے لیے۔ میرے پاس اب کہنے کو پچھنا تھا، سب پچھے اس نے کہہ ڈالا۔ وہ بھی جو خود میں بھی کبھی نہ کہہ پایا نہ خود سے، نہ اپنے آپ سے۔

ہاں، میں ہارون صدر، باتیں چھپا جانے کی عادت ہے مجھے۔ سب بتا کے ایک بات پھر چھپائی تھی میں نے۔ رحمان شخ نے واقعی مجھے اپنی بیٹی کے لیے پسند نہیں کیا تھا بلکہ اس نے مجھے خریدا تھا، درست اندازہ لگایا سونپا نے۔

اس کی ضرورت میں نہیں تھا، ایک نام تھا، کوئی بھی نام جسے وہ فوری طور پر اپنی بیٹی کے نام کے آگے لگا سکے۔ وہ میرا نام نہ ہوتا تو تھی اور کہا ہوتا۔ لیکن جب قدرت نے مجھے یہ موقع دیا تو میں نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اپنا آپ بخوبی آگے بڑھ کے بیچ دیا۔ اپنی پوری زندگی تیخ انڈشرز کے نام رہن رکھ دی۔ اپنا نام تیخ دیا... ہاں اپنا نام.... ہارون صدر.... اور میرا یہ نام تھی.... یعنی نوشیں اپنے نام کے آگے لگا کے خود بھی محفوظ ہو گئی اور اپنی بیٹی کو بھی کر لیا۔ اپنی بیٹی جنی کو۔ جنت ہاردن... ہماری بیٹی جس کی پانچویں سالگرہ ہم نے دو ماہ پہلے دھوم دھام سے منایا ہے۔

اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پانچ ماہ بعد میں اپنی اور نش کی پانچویں دیوںگ اپنی دوسری آشریلیا میں منانے والا ہوں، دھوم دھام سے۔



عمران دلنجست کا ایک حریت لیگریلے

# آئرو ٹکس

آئرو ٹکس میں شائع ہو گتی ہے۔

مکتبہ عمران دلنجست ۲۳۰ روپیہ زار کر لیجی

آشریلیا سیل ہونا چاہتی ہے۔ اگلے بیفتے ہی جاری ہے۔ میں یہیں اسلام آباد میں رہوں گا۔ تم چاہو تو میری زندگی میں شامل ہو سکتی ہو۔ ہم ایک پرسکون اور محبت بھری زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ میں فنا ٹشی اتنا اسٹرونگ ہوں کہ نشی کو آشریلیا اور یہیں پاکستان میں ایک مکمل اور بھربور زندگی دے سکوں۔

”فنا ٹشی اسٹرونگ۔“ اس نے زیر لب دھرا یا اور طنزہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

”لیکن کیا اتنی ہست تم ہیں ہے کہ تم اپنے اس پلان سے اپنی بیوی کو آگاہ کر سکو یا فرقان بٹ کی طرف تم بھی؟“

”میں اسے بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ شاید ایک سال یا شاید اس سے بھی پسلے۔“

”تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔“ اچانک وہ کہہ اٹھی۔

”کیا یہ تمہاری شرط ہے؟“ میں پہلا۔

”میں سمجھ لو۔“

”دیکھو سونپا! ایسا نام مکن ہے۔ میرا مطلب ہے فی الحال۔“ کچھ سبھل کے میں نے سمجھانا چاہا۔ ”یہ سب یہ بزرگ وغیرہ سب اسی کا ہے۔ اگرچہ سب میں ہی ہندل گرتا ہوں، اس نے بھی اپنا حق نہیں جتا یا مکراصل مالک تو وہی ہے۔ رحمان شخ نے جو کچھ میرے نام کیا ہے... اس میں بھی شرط یہی ہے کہ جب تک میں اس کا داماد ہوں، تب تک اس پر اپنی کا وارث ہوں، درست نہیں۔ اتنے بڑے بزرگ ایسا پر کا چیزیں سن میں ایسے ہی نہیں بنتا، اس کے لیے مجھے...“

”اس کے لیے تمہیں ایک بار پھر اپنا آپ بیٹھا رہا۔“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے اس نے کہا اور تھقہ لگا کے ہس پڑی۔ میں مانتھے پر توریاں لیے اسے دیکھتا ہا اور وہ تھکی کہ اس کے قمقے ہی نہ رک رہے تھے۔

”اور تم کہتے ہو کہ تم اب مبدل ہو گئے ہو۔ سب کچھ چھوڑ چکے ہو اور یہ کہ اب مجھے تم سے کوئی لگہ نہیں ہونا چاہیے۔ ارے ہارون صدر! تم تو اب بھی وہی ہو... ہر چیز برائے فردخت.... مسکراہٹ، محبت، نظریں، خواب، فنا، وعدے، بروج، جسم سب برائے فردخت.... سیل سیل سیل.... وہ ہستی جا رہی تھی اور میں بھر بھری ریت کی طرح بکھرتا جا رہا تھا۔

”پہلے تو تم صرف اپنا وقت بیچتے تھے پھر اپنی پوری زندگی